سالنامہ
کھلونا
نئی دہلی
2'50

سال نامہ

کھلونا نئی دہلی

فروری ۱۹۶۹

۲۵۱ واں پرچہ : بائیس واں سال

قیمت سال نامہ : ۲ روپے ۵۰ پیسے

سال بھر کی قیمت : ۸ روپے

مالکان : شمع میگزین   طابع و ناشر : یونس دہلوی

مقام اشاعت، صدر دفاتر : آصف علی روڈ، نئی دہلی

ٹیلی فون : ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۶۷، ۲۷۲۰۶۸

تار کا پتہ : شمع نئی دہلی

دیگر دفاتر : بمبئی، کلکتہ اور مدراس

نگراں:
یوسف دہلوی

مدیر:
الیاس دہلوی

مدیرانِ اعزازی:
یونس دہلوی
ادریس دہلوی

مطبوعہ: امپیریل پریس، دہلی ٹائیٹل کے صفحات: رین بو پرنٹرز دہلی

سال نامہ

کھلونا نئی دہلی

فروری ۱۹۶۹

۲۵۱ واں پرچہ : بائیس واں سال

قیمت سال نامہ : ۲ روپے ۵۰ پیسے

سال بھر کی قیمت : ۸ روپے

مالکان: شمع میگزین طابع و ناشر: یونس دہلوی

مقام اشاعت، صدر دفتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی

ٹیلی فون: ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۶۷، ۲۷۲۰۶۸

تار کا پتہ: شمع نئی دہلی

دیگر دفاتر
بمبئی، کلکتہ
اور مدراس

نگراں :
یوسف دہلوی

مدیر :
الیاس دہلوی

مدیرانِ اعزازی :
یونس دہلوی
ادریس دہلوی

مطبوعہ : امپیریل پریس، دہلی ٹائٹل کے صفحات : رین بو پرنٹرز دہلی

ان کے علاوہ : ★ انعامی تصویر اور انعامی کارٹون کے نتیجے

★ خوب صورت تصاویر ★ عجائبات

★ بے گنتی کارٹون ★ انعامی مقابلے اور بہت سی دلچسپیاں

دماغی امتحان

شیلا اور روحی آپس میں بات چیت کر رہی تھیں "تمہاری کیا عمر ہے ؟" شیلا نے پوچھا۔

"میری عمر کا اندازہ تم خود ہی لگا لو، ویسے چار سال پہلے میری عمر اس عمر سے آدھی تھی جو آج سے چار سال بعد ہوگی۔" روحی نے جواب دیا۔

شیلا نے جو حساب میں بہت ہوشیار تھی، جواب دیا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ چھ سال بعد تمہاری عمر میری اس وقت کی عمر سے دوگنی ہو جائے گی لیکن چھ سال بعد تم مجھ سے صرف تین سال بڑی ہوگی"

—— کیا تم بتا سکتے ہو کہ شیلا اور روحی کی کیا عمر ہے ؟ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر "دماغی امتحان" ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱ کے پتے پر بھیج دو (سال نامے میں شائع ہونے والے تمام انعامی مقابلوں کے جواب ایک ہی لفافے میں علیحدہ علیحدہ کاغذ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔)

۲۴، فروری ۱۹۶۹ تک ملنے والے جوابوں میں جو جواب صحیح ہوں گے، ان میں سے دس پہن کھا کر دو، دو روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔

دماغی امتحان، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱

تماشا بندر والے کا

ابوالاثر حفیظ جالندھری

پیٹھ پہ تھیلا، ہاتھ میں سوٹا   بکرا بھی اک ساتھ ہے موٹا
گاؤں میں بندر والا آیا   ڈگ ڈگ ڈگ کا شور مچایا
ساتھ بندریا ہے اور بندر   آکر ٹھیرا چوک کے اندر
ڈگڈگی اس نے ایسی بجائی   خلقت دوڑی بھاگی آئی
لے کر اپنے بچے بالے   آگئے گاؤں کے بھولے بھالے
لڑکیاں لڑکے شور مچاتے   آئے ہنستے اور چلاتے
ماؤں کے دل میں ہیں دھڑکے   چھیڑتے ہیں بندر کو لڑکے
بندر خو خو کر کے لپکا   لڑکا ڈر کر پیچھے دبکا
بکھر گئے چوک کے چاروں کونے   کھیل لگا بکرے کا ہونے

واہ رے بکرے کیا کہنا ہے
دیکھو کیسا ناچ رہا ہے

اے لو وہ اچھلا ہے بندر   جا بیٹھا بکرے کے اوپر
ہنستی ہے اب خلقت ساری   خوب اسوار ہے خوب اسواری
آئی بندریا لہنگا پہنے   ہاتھ میں لکڑی کان میں گہنے

بول اٹھا ہے بندر والا
ناچ ذرا بندر کی خالا

سر پہ لے کر لال چندریا   ناچ بندریا، ناچ بندریا
ناچ رہی ہے خوب بندریا   بندر کی محبوب بندریا
بندر لیکن سونٹا لایا   بے چاری کو مارنے آیا
بندر کی یوں دیکھ کے غیرت   ہو گئی سب لوگوں کو حیرت
ناچ سے ہٹ گئی وہ بھی بڑھ کر   بندر والے کے سر چڑھ کر
بندر والے کو نہیں گھاٹا   مل گیا اس کو دانہ آٹا

پڑھنے والے گھر کو آئے
کون اب مفت میں وقت گنوائے
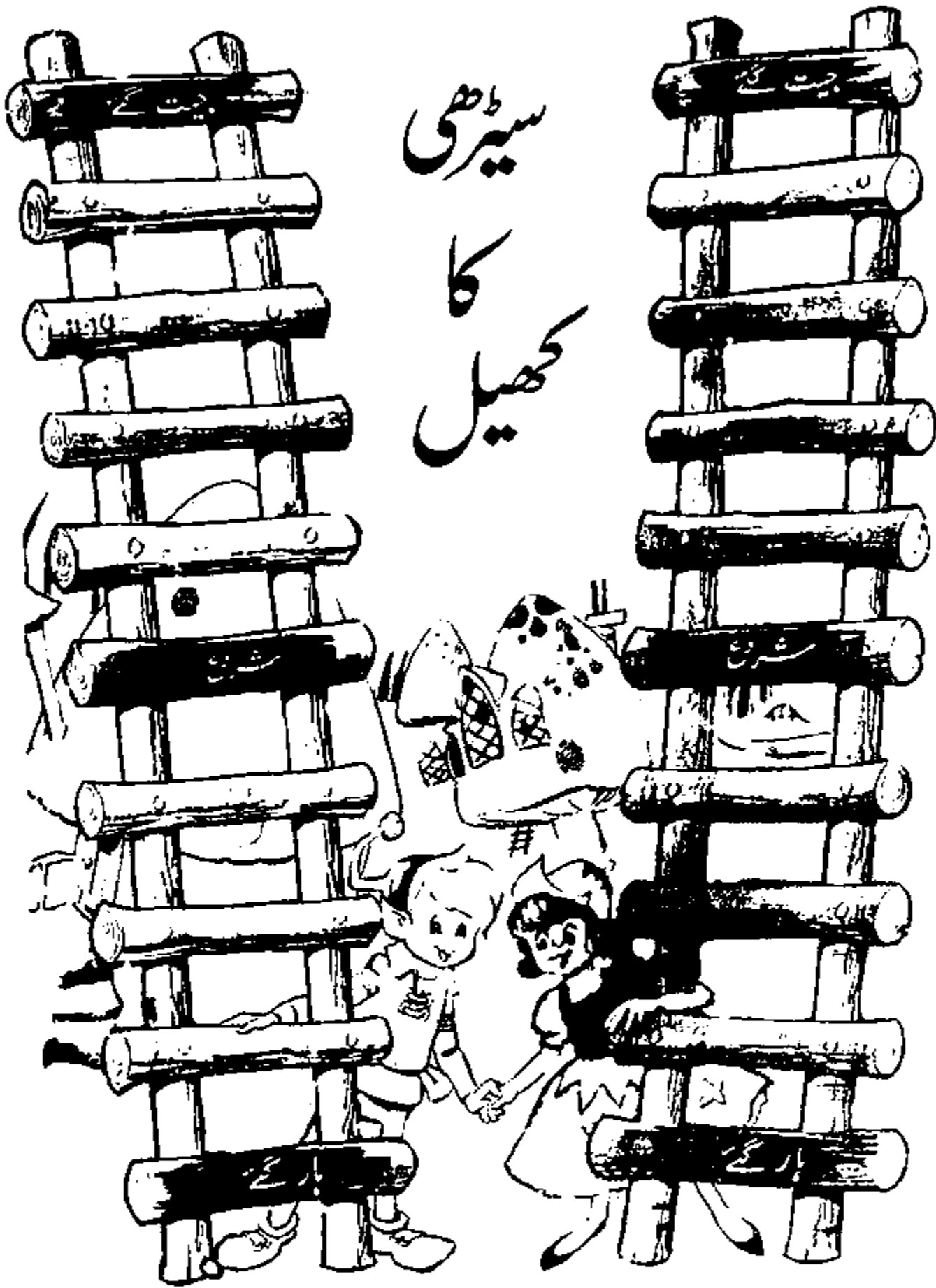
سیڑھی کا کھیل

اس دلچسپ کھیل کے لئے بس ایک سکہ اور دو گوٹیں چاہئیں۔ اپنی پسند کی سیڑھی کے 'شروع' والے ڈنڈے پر دونوں کھلاڑی [illegible] یا مورت۔ پھر کھلاڑی سکہ اچھالتا ہے۔ اگر سکہ اس کے بتائے ہوئے رخ پر گرتا ہے تو وہ سیڑھی پر ایک ڈنڈا اوپر چڑھ جاتا ہے اگر سکہ کھلاڑی کے اندازے کا ساتھ نہیں دیتا تو اسے گوٹ ایک ڈنڈا نیچے ہٹانی پڑتی ہے۔ پھر دوسرا کھلاڑی اسی طرح سکہ اچھال کر گوٹ چلتا ہے۔ کھیل اسی طرح باری باری رہتا ہے۔ فیصلہ اس وقت ہوجاتا ہے جب ان میں سے ایک 'ہار' یا 'جیت' کے ڈنڈے تک پہنچ جائے۔

تین چور

لوت سنگھ

آج سے پینتالیس برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں پنجاب کا صوبہ بہت بڑا تھا۔ اس میں پانچ دریا بہتے تھے۔ اسی لحاظ سے پنج آب، پنجاب کہلاتا تھا۔

اُن دنوں بیساکھی کا موسمی میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس قسم کے میلے پنجاب کے کونے کونے میں لگتے تھے۔ ایسے ہی ایک میلے میں تین دوست بھی شامل ہوئے۔ ان کے نام تھے، رتن سنگھ، کرنار سنگھ اور دھیان سنگھ ان میں سے کسی کی عمر بائیس برس سے اوپر نہیں تھی۔ وہ خوب لمبے تڑنگے بانکے ترچھے جوان تھے۔

سارا دن میلے کی رنگ رلیوں میں گزر گیا۔ دن ڈھلنے پر انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ جتنے روپے لائے تھے، سب خرچ ہو چکے ہیں۔ اب وہ کوئی چیز گھر لے جانے

کے لئے نہیں خرید سکتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ گھر والے پوچھیں گے کہ ہمارے لئے میلہ سے کیا لائے، تو کیا جواب دیں گے — چناں چہ انہوں نے چوری کرنے کی ٹھانی۔

وہ اپنے علاقے میں نہیں تھے۔ اس لئے پہچانے جانے کا بھی خوف نہیں تھا۔ میلے سے چار کوس آگے انہیں ایک گاؤں دکھائی دیا۔ پھیکی چاندنی میں مٹی اور گارے کے مکان ایک دوسرے سے یوں چپکے ہوئے تھے جیسے چوروں سے ڈر کر دبک گئے ہوں۔

گاؤں کے باہر ہی انہیں ایک مکان نظر آیا۔ جس کی دیوار کے ساتھ کوڑے کباڑ کا اونچا سا ڈھیر لگا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے چھت پر چڑھ گئے اور پھر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے منڈیر تک پہنچ گئے جہاں سے انہوں نے نیچے صحن میں نظر ڈالی۔

صحن کے بیچ میں پاس پاس دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ایک پر جو عورت سوئی پڑی تھی وہ سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ خوش ہو گئے۔ لیکن ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا تو دل بیٹھ گیا۔ اس پر ایک لمبا چوڑا ہٹا کٹا۔ کڑیل جوان لیٹا تھا جو غالباً اس عورت کا شوہر تھا۔

تینوں دوستوں کو ڈر لگا کہ کہیں عورت کا شوہر جاگ پڑا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ آخر رتن سنگھ ہمت کر کے صحن میں اتر گیا۔ دو دوست چھت پر لیٹے رہے تاکہ اگر وہ پہلوان جاگ اٹھے تو اچانک حملہ کر کے اسے زیر کر دیں۔

رتن سنگھ نے چارپائی کے نزدیک پہنچ کر بڑی پھرتی سے عورت کے زیورات اتارنے شروع کر دیئے۔ سب زیورات تو اتر گئے۔ صرف ایک بالی رہ گئی جسے اتارنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اچانک عورت نے آنکھیں موندے موندے وہ بالی اتاری اور رتن سنگھ کی طرف بڑھا دی۔ وہ حیران رہ گیا۔ عورت مسکرا کر بولی: "اگر خیریت چاہتے ہو تو میرے سارے زیور لوٹا دو۔ ورنہ میں اپنے مرد کو جگا دوں گی۔

اس پر رتن سنگھ اکڑ کر بولا: "تمہارا مرد جاگ کر بھی ہمارا کیا بگاڑ لے گا!"

"تم نہیں مانتے تو جاؤ — جب تم چار کھیت پرے ببول کے پیڑ کے نزدیک پہنچ جاؤ گے تو میں اپنے مرد کو جگا دوں گی۔ اگر اس میں دم ہوگا تو وہ تم لوگوں سے زیور چھین لے گا!"

رتن سنگھ نے عورت کی یہ شرط منظور کر لی۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے بھاگ نکلا۔ جب وہ تینوں ببول

کے پیڑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے گردن گھما کر گاؤں پر نظر ڈالی ——

چھت پر انہیں وہی پہلوان سردار دکھائی دیا۔

ان کا خیال تھا کہ وہ بھاری بھرکم جوان دوڑ میں انہیں نہیں پا سکے گا۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ کیوں کہ بہت جلد ہی وہ شخص ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اب بھی انہوں نے بچنے کی ترکیب نہ سوچی تو وہ ان کے سر پر آ دھمکے گا۔

آگے پیچھے دوڑتے دوڑتے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ آگے کے دونوں نوجوان سامنے والی دو جھاڑیوں میں چھپ جائیں گے۔ سب سے پیچھے والا جوان رتن سنگھ بھاگتا چلا جائے گا۔ ان کا پیچھا کرنے والا یہی سمجھے گا کہ وہ تینوں آگے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس طرح جب وہ دو جھاڑیوں کے بیچ میں ہو کر نکلے گا تو کرتار سنگھ اور دھیان سنگھ حملہ کر کے اسے مار گرائیں گے۔

انہوں نے اسی ترکیب پر عمل کیا۔ ان کا پیچھا کرنے والا جوان دھوکے میں آ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان تینوں چوروں کی لاٹھیوں کی مار کی تاب نہ لا سکا۔ اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

تینوں دوست اپنے منصوبے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن دل میں وہ خوش نہیں تھے۔ انہوں نے سوچا کہ انہوں نے اتنے اچھے جوان کو دھوکے سے مار گرایا تھا۔ انہیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ کہیں اس کی موت ہی نہ ہو گئی ہو۔ چنانچہ دوسرے دن ایک ایک کر کے وہ گاؤں میں جا گھسے ——
اس مرد کا نام درشن سنگھ تھا اور وہ اپنے مکان کے باہر دالانے (چوپال) میں پڑا تھا۔ اس کی جان خطرے میں بالکل نہیں تھی۔

رتن سنگھ اور اس کے دوستوں کو بڑی شرم محسوس ہوئی۔ دن کی روشنی میں انہوں نے درشن سنگھ کو دیکھا تو ان کے دل میں ذرہ برابر بھی شبہ نہ رہا کہ اگر وہ مردوں کی طرح دھوکہ دیئے بغیر اپنے دشمن پر حملہ کرتے تو مارا جاتے۔

یہ سب باتیں سوچ کر انہوں نے سارے زیور لوٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ چناں چہ وہ درشن سنگھ کے مکان کے قریب سے ہو کر گزرے اور زیوروں کی پوٹلی مکان کے صحن میں پھینک کر اپنے گاؤں کو لوٹ آئے۔

■ ■

ریل کا ڈبّا

محمد شفیع الدین نیّر

ریل کا ڈبّا بھرا ہوا ہے　　اسٹیشن پر کھڑا ہوا ہے
ایسے ہی کچھ اور بھی ڈبّے　　ہیں اس کے آگے اور پیچھے
جگہ نہیں ہے تِل دھرنے کو　　اک اک سیٹ پہ دیکھو دو دو
وہ اُس پر آکر گرتا ہے　　یہ اس پہ جا کر گرتا ہے
گٹھری مٹھری بیگ اور بستر　　لائے قلی ہیں سر پہ رکھ کر
کیسا کچھ دھکم دھکا ہے
ڈبے میں کہرام مچا ہے
بابو، لیڈر، نوکر، چاکر　　پنڈت مُلّا بیٹھے آکر
نر بھی اُن میں ہیں ناری بھی　　بنیے بھی ہیں پنساری بھی
بوڑھے، بچّوں والے بھی ہیں　　گورے بھی ہیں کالے بھی ہیں
شہری اور دہاتی بھائی　　دُولھا اور بَراتی بھائی
بھیڑ ہے کتنی کیا بتلائیں　　ڈبّے میں گھُسنے بھی نہ پائیں
دھکّا مُکّی کرتے، بڑھتے
لوگ رہے ڈبّے میں چڑھ کے

باہر سے آوازیں آئیں　　سب کے کانوں سے ٹکرائیں
پاپڑ اور سموسے لے لو　　لے لو دس دس پیسے لے لو
لڈّو پیڑے اور جلیبی　　حلوا پوری ٹکتی ، برفی
چائے ہماری پی کر جاؤ　　بسکٹ کھاؤ، کیک اُڑاؤ
دیکھو پھل والوں کے ٹھیلے　　لے لو آم، امرود اور کیلے
اخبار اور رسالے بھی ہیں　　گڑیوں گڈّوں والے بھی ہیں

صورت اک سے ایک نئی ہے
ہر سُو چیخم دھاڑ مچی ہے

ایک مہاشے جی ہیں ایسے　　کرتے سفر ہیں جو بے پیسے
چوٹ وطن کو دیتے ہیں یہ　　پاپ کا پھل چن لیتے ہیں یہ
جنٹلمین اِک جیب کترتے　　پکڑے گئے اس بھیڑ میں چڑھتے
ٹکٹ کلکٹر وردی ڈانٹے　　پھرتے ہیں اپنی شان جماتے
اِدھر اُدھر پولس کے سپاہی　　دکھلاتے ہیں تانا شاہی
ہر ہر سمت ہے افراتفری　　ہر جانب ہے نفسا نفسی

تم بھی ریل میں جانا چاہو
تیز ڈبے میں گھس جاؤ

کلھاڑی کا سوپ

عادل رشید

صدیوں پہلے کی بات ہے۔ مہاتما بدھ کے انتقال کے
بعد اُن کے چیلے اور ان کے چیلوں کے چیلے سارے ملک میں اِدھر
اُدھر پھیل کر بدھ مذہب کی تعلیمات کو گھر گھر پھیلانے اور عام کرنے
کی جدّو جہد میں لگے ہوتے تھے۔ یہ بھکشو شہر شہر اور گاؤں گاؤں
پھرا کرتے تھے۔ ان ہی بھکشوؤں میں ایک بھکشو تھا باسودیو۔ وہ
بہت ہی چھوٹی عمر کا بھکشو تھا۔ یہی کوئی چودہ پندرہ سال کا ہوگا
ایک دن اس کا گزر ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوا۔

بھکشو دو وقت کا بھوکا تھا اُس نے ایک کسان کے
دروازے پر پہنچ کر بھکشا مانگی "کچھ کھانے کو ملے گا"

ایک غریب بوڑھی عورت نے بھکشو کے آگے ہاتھ جوڑ

یہ تمہارا سسر کہاں غائب ہو گیا، تم تو شکار تلاش کرنے گئے تھے

کر کہا "مہاراج! ہم خود دو وقت سے بھوکے ہیں، ہمارے گھر میں ایک دانہ بھی نہیں ہے۔"

"خدا پر بھروسہ رکھو ماں۔ خدا کرے تمہاری بھوک دور ہو۔" بھکشو نے کہا۔ اور وہ دعا دے کر آگے بڑھا ہی تھا کہ اس بڑھیا نے کہا "اس گاؤں کے سب لوگ ہمارے ہی جیسے ننگے اور بھوکے ہیں بیٹا۔ لیکن اس گاؤں میں ایک ہی مالدار بڑھیا بھی ہے۔"

"کہاں رہتی ہے وہ؟"

"اس گاؤں کے سرے پر اس کا مکان ہے۔" غریب بڑھیا نے بھکشو کو بتایا "لیکن وہ اتنی کنجوس ہے کہ ایک ٹکڑا روٹی تو کیا وہ کسی کو چٹکی بھر نمک بھی نہیں دیتی۔"

"اچھا!"

"ہاں بیٹا ـــــ"

"لیکن میرا مقصد وہاں حل ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ بھکشو باسودیو وہاں سے چل کر اس بڑھیا کے دروازے پر پہنچ گیا۔

اس نے آواز لگائی ہی تھی کہ بڑھیا نے آتے ہی کہا "یہاں کیا دھرا ہے جو تم آواز لگا رہے ہو؟"

"مجھے آپ سے بھکشا نہیں چاہیے ماں۔"

"پھر؟" بڑھیا نے پوچھا۔

باسودیو بولا "مجھے کلہاڑی کا سوپ بنانا ہے مائی۔ اگر تم ایک پتیلی اور پانی دے دو تو......"

"کلہاڑی کا سوپ!" بڑھیا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟"

"ارے ـــــ!" باسودیو بولا "تو کیا تم نے کلہاڑی کا سوپ آج تک نہیں پیا ہے؟ کلہاڑی کا سوپ تو اتنا مزے دار ہوتا ہے کہ واہ۔"

"سچ؟"

"ہاں، ہاں، تم مجھے ایک پتیلی اور تھوڑا سا پانی تو دے دو ماں، میں ابھی تمہیں کلہاڑی کا سوپ بنا کر پلاتا ہوں۔"

بڑھیا نے پتیلی اور پانی کی بالٹی لا کر اسے دے دی۔

باسودیو نے اپنے تھیلے میں سے ایک کلہاڑی نکالی، اسے دھو دھا کر پتیلی میں رکھا، اور پھر پتیلی میں پانی ڈال کر اس نے اسے اینٹوں کے چولہے پر رکھ دیا۔ اور آگ جلا دی۔

بڑھیا یہ سب بڑی حیرت اور بڑے غور سے دیکھ رہی تھی، کچھ دیر بعد باسودیو نے پتیلی سے پانی نکال کر چکھا "آہا!" اس نے چٹخارے لئے "بے حد مزے دار! بس اگر ذرا سا نمک اور مرچ مل جاتا تو واہ۔" اور اس نے بڑھیا سے پوچھا "تھوڑا سا نمک اور مرچ تو ہوگا مائی؟"

"ہاں ـــ وہ تو ہے۔"

بڑھیا نے جس کی دلچسپی اس کلہاڑی کے سوپ سے

بڑھتی جا رہی تھی، نمک اور مرچ لا کر اسے دیا۔

بھکشو نے نمک اور مرچ پتیلی میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اس سوپ کو پھر چکھا۔

"واہ واہ ——" اس نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔

"بس ذرا سا بیسن ہوتا تو واہ کام بن جاتا۔" اس نے بڑھیا سے پوچھا" تھوڑا سا بیسن ہوگا ماں؟"

"ہاں، ہاں۔" بڑھیا نے کہا۔ اور اس نے اس بھکشو کو بیسن بھی لا کر دے دیا۔

بھکشو بیسن پتیلی میں ڈال کر گھونٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے اسے دیکھا۔

"بس اب کلہاڑی کا سوپ تیار ہے۔ واہ واہ کیا مزا ہے اس میں!" اور پھر اس نے کہا" اگر ماں تم ذرا ایک ٹماٹر لا کر مجھے دے دو تو اس کا مزہ اور بڑھ جائے۔ پھر تم دیکھنا کہ یہ کیسے مزے دار قسم کا سوپ بنتا ہے۔ اور اگر ذرا ایک آلو اور گاجریں بھی مل جائیں تو بس واہ —— مزا آجائے۔"

"آلو بھی ہے اور گاجریں بھی۔"

"تو پھر لاؤ ماں۔ اور پھر تم چکھ کر دیکھنا کہ یہ کیا چیز بنی ہے، تم نے کلہاڑی کا یہ سوپ آج تک نہ چکھا ہوگا۔"

بڑھیا نے جس کا اشتیاق اس کلہاڑی کے سوپ کے بارے میں بڑھتا جا رہا تھا، اسے یہ چیزیں بھی لا کر دے دیں۔

کچھ دیر بعد کلہاڑی کا سوپ تیار ہو گیا۔ بھکشو نے پتیلی چولہے پر سے اتاری۔ بڑھیا بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ باسودیو نے کہا "بس اب سوپ تیار ہے ماں۔ تم مجھے ایک پلیٹ لا کر دے دو اور اپنے لئے بھی تم ایک پلیٹ لے آؤ ماں۔ پھر چکھ کر دیکھو کہ کلہاڑی کا یہ سوپ دنیا کی انوکھی چیز ہے کہ نہیں۔"

بڑھیا پلیٹیں لے کر آگئی۔ باسودیو نے پلیٹوں میں کلہاڑی کا سوپ نکالا۔

سال گرہ مبارک

بھکشو چٹخارے لے کر سوپ پینے لگا۔ بڑھیا نے بھی سوپ پیا۔

"واقعی یہ مزے دار سوپ ہے۔" بڑھیا نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

سوپ کھا پی کر اور چاٹ پونچھ کر باسودیو نے کلہاڑی دھو دھا کر اپنے تھیلے میں رکھی۔ پتیلی اور پلیٹ دھو کر اس نے بڑھیا کے حوالے کی، اور بڑھیا کو آشیرواد اور دعائیں دیتا ہوا اپنی راہ ہو لیا۔

اس طرح اس نے اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے اپنی بھوک کا علاج کر لیا، اور اس کنجوس بڑھیا سے بھی مدد حاصل کر لی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی کی مدد نہیں کرتی ہے۔ ●●

لائبریری میں
خاموش رہیے!

فتحِ مہتاب

واثق جونپوری
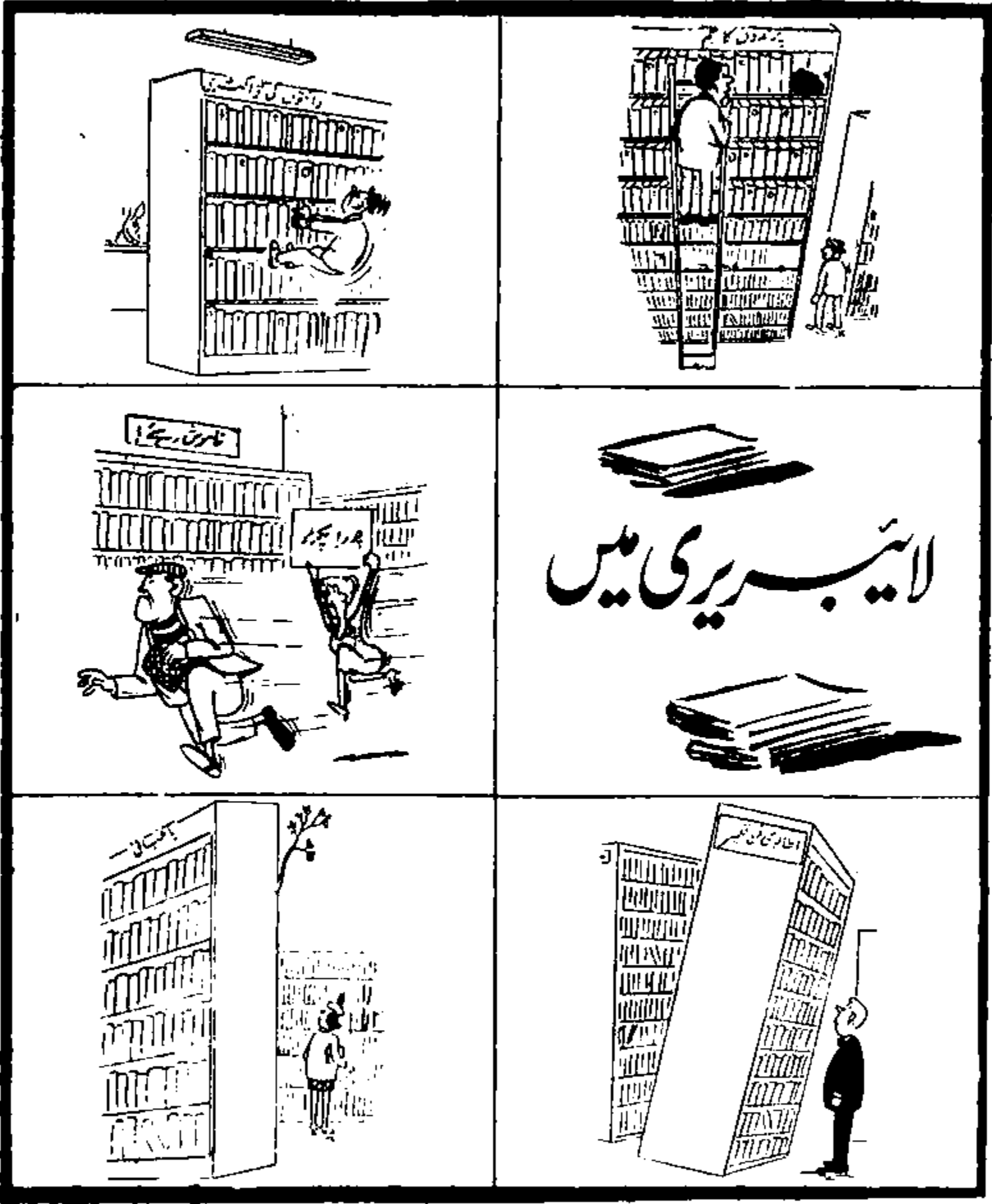
چاند کی سیر پہ انسان کمربستہ ہے
شوقِ بے پایاں میں ہر خطرہ پہ آمادہ ہے
جان پر کھیل کے اُڑتا ہی چلا جاتا ہے
چاند کی سیر پہ انسان کمربستہ ہے

تیز رفتاری نے آواز کو پیچھے چھوڑا
قوتِ جدت نے دیوارِ خلا کو توڑا
چاند کو چھو کے پلٹ آنے کا اب قصہ ہے
چاند کی سیر پہ انسان کمربستہ ہے

چاند کے گرد لگا گھومنے اِس طرح بشر
کوچۂ محبوب کا جیسے کوئی کاٹے چکّر
اپنی مجبوری کا احساس مگر رکھتا ہے
چاند کی سیر پہ انسان کمربستہ ہے

اجنبی خاک پہ اب پڑنے ہی والے ہیں قدم
اُس پہ لہرانے ہی والا ہے زمیں کا پرچم
فتحِ مہتاب نئی راہوں کا سرچشمہ ہے
چاند کی سیر پہ انسان کمربستہ ہے

چاند پر ہونے تو دو حضرتِ انساں کا گزر
چاند پر بچّوں کے میلے بھی لگیں گے اکثر
کودنے میں وہاں سنتے ہیں مزا آتا ہے
چاند کی سیر پہ انسان کمربستہ ہے

نل درست کرنے
میں کیا تھا۔

افسوس ہے جناب مگر دس پیسے مزدوری پاکر میرے
ہاتھ پاؤں خوشی سے ایسے پھولے کہ صندوق چھوٹ گیا

جب تم بڑے ہو جاؤ گے
تو کیا بنو گے۔
بڈھا!

تو انہوں نے تمہارا گھوڑا، رقم، گھڑی
سب کچھ چھین لیا۔ کیا تمہارے پاس
بندوق نہیں تھی؟
تھی تو لیکن میں نے
اسے چھپا دیا تھا۔

ٹھیک ٹھیک بتاؤ پستول تم نے
کہاں چھپایا ہے؟

اس رقم میں ہیرے کے لئے
آپ نے کچھ
نہیں لیا۔
ہیرا میں نے کب کہا ہے؟

انکم ٹیکس
والوں کی
پرورش کیلئے

عصمت چغتائی

زمانہ دن بدن ترقی کرتا جا رہا ہے۔ بچّوں کے کھلونوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، اور جی چاہتا ہے کاش پھر سے بچّے بن جائیں۔ کیسے کیسے کارآمد اور خوب صورت کھلونے ایجاد کیے ہیں انسان نے۔ کھلونے تو ہمارے بچپن میں بھی ہُوا کرتے ہوں گے مگر ہمارے آبا میاں کھلونوں میں پیسے برباد کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ کبھی میلے ٹھیلے میں مٹی کی بدصورت گڑیاں، ہاتھی گھوڑے نظر آجاتے تھے، اور ذرا سی دیر میں چھینا جھپٹی میں ٹوٹ ٹاٹ کے برابر ہوتے۔ ویسے آبا میاں لڑکوں کو ایک فٹ بال دلوا دیتے تھے۔ جب ٹوٹ جاتی تو دوسری آجاتی۔ اور لڑکیوں کو اماں کپڑے کی گڑیاں بنا دیتیں،

جادوگرِ اعظم

پروفیسر صاحب آج آپ سے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے!

جو دو چار دن میں ہی میلی چیکٹ ہو جاتیں۔ اور دل ان سے اکتا جاتے۔

مگر بچوں کو تو کچھ کھیل چاہیے۔ ہم سب کی اپنی اپنی کیاریاں تھیں۔ ان میں طرح طرح کے پودے لگائے جاتے۔ جب لڑائی ہوتی تو ایک دوسرے کی کیاریاں خوب کھسوٹی جاتیں اور ایک طوفان آجاتا۔ اس کے علاوہ ہر ایک نے کوئی نہ کوئی جانور پال رکھا تھا۔ کسی کا طوطا تھا تو کسی کی مینا، سڑک سے کوئی کتے کا پلا اٹھا لاتا، کوئی بلی کا بچہ کلیجے سے لگائے پھرتا۔ چیل اور گھگو کے بچے بھی پال کر دیکھے، مگر وہ اتنے بدمزاج ہوتے تھے کہ کبھی مانوس ہی نہ ہوتے، بے حد کاٹتے اور پنجے مارتے۔ ہاں گلہری کا بچہ بڑا پیارا ہوا کرتا تھا مگر بڑا ہوا اور بھاگا۔ جنگلوں میں موروں کو دیکھ دیکھ کر بڑا جی للچاتا۔ ان کے حسین پر جمع کر کے سپاروں میں سبق کی نشانی کے لئے رکھتے۔ مور کے پر کو کتاب میں دبا کر کھینچو تو کئی بار ایسا کرنے سے اس میں بجلی سی پیدا ہو جاتی ہے، پھر دیوار پر چپکاؤ تو کچھ دیر تک چپکا رہتا ہے۔ مور کے پروں کا مقابلہ ہوا کرتا تھا کہ دیکھیں کس کا پر دیر تک دیوار پر چپکا رہتا ہے

ہمیں مور کے بچے پالنے کا بڑا شوق تھا مگر کبھی دیکھنے کو بھی نہیں ملے۔ یوں ہی جنگل میں ڈھونڈتے پھرتے، اِدھر اُدھر پوچھتے پھرتے مگر کوئی مور کے بچوں کا اتا پتہ نہ بتاتا تھا۔ گھنے جنگل میں جاتے ڈر لگتا تھا، کیوں کہ وہاں شیر بھی آیا کرتا تھا۔ سوچتے تھے کہ کہیں سے انڈے ہی مل جائیں تو مرغی کے نیچے رکھ کر بچے نکالیں پھر جب وہ بڑے ہو جائیں تو ان کا ناچ دیکھیں۔

ایک دن جلتی دوپہر میں مور کے بچوں کے فراق نے ہمیں ایسا بے چین کیا کہ ہم گھر سے کافی دور نکل گئے۔ تالاب میں کنکر پھینک رہے تھے اور موروں کے خواب دیکھ رہے تھے کہ پیڑ کے تنے سے لگا ہوا ایک آدمی ہمیں نظر آیا۔ عجب مسخرہ سا سو رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر بڑی ہنسی آئی۔ رائے ہوئی، لاؤ اس کے کان میں پھریری کریں۔ یہ عمل کرتے ہی وہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا اور لپک کر اس نے اپنا ڈنڈا سنبھالا۔ ہم ہنستے ہوئے اُچھلنے کودنے لگے۔

"بھاگو یہاں سے!" اُس نے ڈنڈا پھٹکارا۔

"ارے ہم ڈپٹی صاحب کے لڑکے ہیں، تم کون ہوتے ہو ہمیں بھگانے والے؟" ہم نے اکڑ کر کہا، "پتہ ہے تمہیں جیل میں ٹھونس دیں گے ہم!"

نہ جانے ان الفاظ میں کیسا زہر تھا کہ اس آدمی کا چہرہ بھوت کی طرح سیاہ ہو گیا۔ آنکھیں خونِ کبوتر ہو گئیں۔ ہونٹ سکیڑ کر پیلے پیلے دانت کٹکٹانے لگا۔ تب تو ہمیں بھی اس سے ڈر لگنے لگا۔ مگر ڈٹے کھڑے رہے۔

اُن دنوں تنا کوئی دس برس کے ہوں گے، میں ساڑھے آٹھ کے لگ بھگ اور چنو بے چارہ تو سات کا بھی نہ ہوگا۔ آج کل تو اتنے بڑے بچوں کو مائیں گود میں لئے پھرتی ہیں۔ مگر ہم

کو آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ لیکن ہم صبح سے شام
تک مارے مارے پھرتے تھے۔ خوب باغوں اور جنگلوں میں
کچے پکے پھل کھاتے پھرتے، جھرنوں کا پانی پیتے، صبح کے
نکلے کبھی کبھی شام کو گھر میں گھستے۔ کپڑے تار تار۔ گھٹنے
کہنیاں چھلی ہوئی۔ سر میں منوں خاک۔

" ہُوں تو تم ڈپٹی صاحب کے لڑکے ہو" اس آدمی
نے غرّا کر کہا۔

" ہاں ـــــ اور ہم مور کے بچے ڈھونڈنے آئے ہیں
تم نے مور کے بچے دیکھے ہیں؟"

" بہت " اس کا چہرہ کچھ نرم پڑا۔ " مگر تم سے چلا
نہیں جائے گا۔ بہت دُور ہے جنگل۔"

" نہیں ہم چل لیں گے۔"

وہ اُٹھ کر چلنے لگا۔ ہم اس کے پیچھے لگ گئے۔

" دکھاؤ مور کے بچے۔"

" بھاگ جاؤ۔" وہ ایک دم غرّایا، اور تیز تیز چلنے لگا۔
عجیب پُراسرار سا آدمی تھا۔ اُسے اتنا غصّہ کیوں آ رہا تھا؟

" ہم تمہیں دو پیسے دیں گے۔" ہم نے اُسے لالچ دیا۔

" دیکھو سیدھے بھاگ جاؤ ـــــ نہیں تو۔۔۔۔
وہ ڈگ بھرنے لگا۔

" سور! الّو! پاجی! چور!" چنّو چلّایا۔

" چور!" وہ ایک دم پلٹا اور ہم واقعی سہم گئے۔
ایسا لگا کہ ڈنڈے سے ہمارے سر پھاڑ دے گا " ہُوں، مور
کے بچے دیکھو گے؟"

" ہاں " ہم نے ڈرتے ڈرتے اقرار کیا۔

" تو آؤ " اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ وہ اتنا
سرپٹ چل رہا تھا کہ ہمیں اس کے ساتھ بھاگنا پڑ رہا تھا۔
نہ جانے مور کے بچوں کا شوق کیسا سر پر سوار تھا کہ

معاف کیجئے ـــــ میں آج ہی رہا کیا گیا تھا لیکن مجھے
رہنے کے لئے کوئی جگہ کرائے پر نہیں ملی

ہم بھی چلتے چلے گئے۔ اب جنگل ایک دم سے گھنا ہو گیا تھا
اور وہ تیز بھی نہیں چل رہا تھا۔ چنّو اور ننّا تو پھرتیلے تھے ہی۔ دن
بھر ہرنوں کی طرح قلانچیں لگاتے تھے۔ وہ بھلا کیا تھکتے۔ ہاں
میں ذرا موٹی اور بھدّی۔ مگر اس کا اقرار کرتی تو پھر وہ مجھے
کبھی ساتھ نہ لے جایا کرتے۔ ویسے ہی وہ مجھے بہت ذلیل
شے سمجھتے تھے، کیوں کہ میں لڑکی تھی۔ مگر میں بھی اُن کی دُم
کے پیچھے لگی ہی رہتی تھی۔

اب راستہ ناہموار بھی ہونے لگا۔ میں مونہہ بسورنے
لگی۔ ننّا نے اُس آدمی سے کہا " کہاں ہیں مور کے بچے!"

" بس تھوڑی دُور" اس نے اپنے ڈنڈے سے راستہ
بناتے ہوئے کہا۔

ہم پھر گھسٹنے لگے۔ سب آگے نکل جاتے۔ میں پیچھے
بھاگتی رہ جاتی اور جھنکھاڑ نے لگتی تو وہ ذرا رک جاتے۔ مجھے
بڑا سخت احساسِ کمتری ہو رہا تھا۔ کئی دفعہ گری بھی۔ گھٹنے
چھِل گئے۔ اور میں نے چلّا چلّا کر رونا شروع کر دیا۔

" چُپ بھتنی کہیں کی۔" ننّا نے مجھے ڈانٹا۔ اور جب
میں اور جھنکھاڑی تو وہ آدمی مجھے ایسے دیکھنے لگا کہ میری گھگھی
بندھ گئی۔

بھائی صاحب ـــــ میری صندوقچی کی چابی کھو گئی ہے
ذرا اس کا تالا بھی توڑتے جایئے

"اچھا اسے یہیں چھوڑ دو۔" اس نے چنو اور رشنا کو رائے دی اور چل دیا۔ میں نے گلا پھاڑا اور وہیں پسکڑا مار کر لوٹنے لگی۔

کچھ مور کے بچوں کا شوق، کچھ دونوں نے گھسیٹا۔ میں پھر چلنے لگی۔ رو پیٹ کر کچھ جی بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گرمی بھی کم ہو گئی تھی۔ تالاب سے پانی پی کر ہم پھر چل پڑے۔

خدا جانے ہم گھر سے کتنے میل نکل آئے ہوں گے۔ دُور دُور آبادی کا نشان نہ تھا۔ اِکا دُکا آدمی بھی اب راستے میں نہیں مل رہے تھے۔ ہم نے کچھ کچے امرود کھائے۔ بیر بھی جھولیوں میں بھر لئے۔ مگر تھکن اب بے تحاشہ ہو رہی تھی اور میں برابر ٹھنک رہی تھی۔

"ابھی کتنی دور اور ہے؟" چنو نے آدمی سے پوچھا۔

"بس تھوڑی سی دُور۔" وہ کتنی دیر سے یہی جواب دے رہا تھا۔

"بھئی آدمی، شام ہو گئی۔ اب واپس چلو۔" چنو نے کہا۔

"واپس؟ تو جاؤ ـــــ" وہ مڑ کر چل دیا۔ اور بڑے مشکل راستے پر چڑھنے لگا۔

"ٹھیرو آدمی . . . . ہم سب بہت تھک گئے ہیں۔"

وہ بے رُخی سے اُوپر چڑھ گیا۔ مڑ کر ایک بار ہمیں دیکھا۔ پھر ایک شیطان جیسا قہقہہ لگایا، "جاؤ۔"

"مگر ہمیں راستہ جو نہیں معلوم۔" ہم اس کے پیچھے چڑھنے لگے۔

"تو پھر آؤ۔" وہ پھر چل دیا۔

"آدمی . . . . بہت اندھیرا ہوتا جا رہا ہے۔ ٹھیرو آدمی۔" ہم اب بالکل تھک کر چُور ہو گئے تھے۔ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ گھٹنوں کی چوٹیں آنسو رُلا رہی تھیں۔ اب ہمیں کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر چلا جا رہا تھا۔ کبھی کسی پیڑ کی آڑ میں غائب ہو جاتا اور ہم بوکھلاتے ہوئے اُسے ڈھونڈتے تب وہ بالکل ہمارے قریب سے قہقہہ مارتا پیڑ کی آڑ سے نکل پڑتا۔

"چور . . . چور . . . . ہونہہ! اجیل میں سڑوا دیں گے۔" وہ نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ شاید وہ بھی تھک گیا تھا۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر چلم پینے لگا۔ ہمیں بھی ستانے کا ذرا موقع ملا۔

"آدمی اب رات ہو گئی۔"

"تو میں کیا کروں؟" وہ بھونکا

"ہمیں گھر پہنچا دو۔"

"میں کوئی تمہارے باپ کا نوکر ہوں۔" وہ ایک دم گالیاں بکنے لگا۔

"سنو آدمی۔" اب ہماری ساری اکڑ فوں غائب ہو چکی تھی، "تم ہمیں گھر پہنچا دو تو ہم تمہیں انعام دلوائیں گے۔"

"انعام . . . . ہاہا ـــــ" اس نے قہقہہ لگایا۔

وہ تو مجھے دس سال ہوئے مل چکا۔"

ہم کچھ نہیں سمجھے۔ دس سال پہلے تو ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

"ہم نہیں دیکھتے مور کے بچے۔ ہم تو گھر جائیں گے" میں منمنائی۔

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو آدمی"

"تمہارے باپ نے مجھے آٹھ سال کی سزا دے دی اور میں نے چوری بھی نہیں کی تھی"

"مگر تم نے کیوں نہیں کہا کہ تم نے چوری نہیں کی"

"بہت کہا۔ مگر وہ تھانے دار میرا دشمن تھا اس خبیث نے جھوٹی گواہی دلوادی، وہ بہت گالیاں بکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کے مونہہ میں سے ضرور بدبو آرہی ہوگی۔

"سب میرے دشمن ہو گئے" "ڈپٹی بھی دشمن ہو گیا یعنی تمہارا باپ!"

"مگر ہمارے باپ تو جب کان پور میں تھے"

"یہ کان پور کی ہی بات ہے۔ اُس نے بے ایمان تھانے دار کی بات مانی۔ میری ایک نہیں سنی۔ مجھے آٹھ سال جیل میں سڑایا"

"تم نے بہت بڑی چوری کی تھی؟"

"میں نے چوری نہیں کی تھی۔ مجھے زمین دار نے پھنسا دیا۔ قتل کا جھوٹا الزام لگایا" اس کی آنکھیں پھر انگارے اُگلنے لگیں، "میرے پیچھے میری بچی مر گئی۔ میری بیوی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی" وہ ایک دم اُٹھ کر تیز تیز چلنے لگا۔

"ٹھیرو آدمی۔ اب ہم سے بالکل نہیں چلا جاتا"

ہم اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ وہ ایک دم پلٹا اور غصے کے مارے دیوانہ ہو گیا۔

"بھاگ جاؤ کم بختو! نہیں تو . . . . ." وہ لاٹھی تان کر جھپٹا۔ مگر رُک گیا۔ پھر ہنسا۔ "میں بے گناہ تھا۔

صرف خراٹے سن لو ــــ جگانا نہیں، آج انہوں نے دفتر میں بہت زیادہ کام کیا ہے

اور آج بھی میں اپنے ہاتھ خون میں کیوں رنگوں، یہی سوچتا ہوں۔ اب تم لوگ مجھے غصہ نہ دلاؤ" وہ آہستہ آہستہ جانے لگا۔

"تو مور کے بچوں کا بہانہ تھا۔ تم ہمیں بدلہ لینے کے لئے لائے تھے"

وہ رُکا۔ ــــ مگر اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا ہم وہاں سے گرتے پڑتے واپس بھاگے۔

رات کافی گہری ہو گئی تھی۔ مگر چاند نکل آیا تھا اور راستہ صاف نظر آرہا تھا۔

میں ٹسر ٹسر روتی پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ آدمی نظروں سے اُوجھل ہو چکا تھا۔ ہم ایک گھنٹے تک چلتے رہے، کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ ایک دم ہم پھر وہیں پہنچ گئے جہاں وہ آدمی غائب ہوا تھا۔ خوف سے ہماری بُری حالت ہو گئی۔ ہم گھر کی طرف نہیں جا رہے تھے، بلکہ جنگل میں گول چکر لگا کر پھر وہیں آگئے تھے۔ اب میرے آنسو غائب ہو گئے۔ رونے بسورنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک دم سے ہم بڑے ہو گئے۔ چنو ننا شریر بھائی نہیں، مجھے اپنے رفیق معلوم ہو رہے تھے۔ اور وہ بھی مجھے بالکل چھیڑ نہیں رہے تھے۔ ایسے موقع پر لڑنا جھگڑنا حماقت ہے۔ مگر ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ غصہ آرہا تھا۔ ٹانگیں درد سے پھٹی جا رہی تھیں۔ چوٹوں میں آگ سی دہک

سیب توڑنے کی
ترکیب

رہی تھی۔ ڈرا لگ رہا تھا۔

ایک دم سے جنگل بھیانک ہونے لگا۔ پیڑوں کے کالے کالے بھوت ڈرانے لگے۔ قسم قسم کے جانور جاگ اُٹھے۔

نہ جانے کیا بجا تھا۔ ہمیں چلتے چلتے اور ایک گھنٹہ گزر گیا ہوگا۔ اب کچھ بادل بھی آنے لگے، اور رات اور بھی ڈراؤنی ہونے لگی۔ ہمارے دل دھکڑ پکڑ کر رہے تھے۔ آخر تھک کر ہم سستانے کے لئے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ میں چپکے چپکے رونے لگی۔ اب ہم اس جنگل سے کبھی نہ نکل پائیں گے۔ ساری عمر یہیں بھٹکتے پھریں گے ' گھر ' جہاں ایک منٹ کو دل نہ لگتا تھا بُری طرح یاد آنے لگا۔ سب نے کھانا کھا لیا ہوگا۔

ہمارا کچھ قصور نہ تھا، پھر بھی آدمی نے اپنی تکلیفوں کا ہم سے بدلہ لیا تھا۔ لیکن وہ رحم دل بھی تو تھا۔ اسی لئے تو اُس نے ہمیں زندہ چھوڑ دیا —— مرنے کے لئے چھوڑ دیا، کیوں کہ زندہ گھر پہنچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ہم بجائے گھر کی طرف چلنے کے غلطی سے اور گھنے جنگل میں گھُستے چلے جا رہے تھے۔

ایک دم سے ہوائیں زور زور سے چلنے لگیں۔ گھپ اندھیرا ہو گیا۔ پھر زور شور سے بارش ہونے لگی۔ ہم بھیگتے ہوئے اندھیرے میں ٹٹولتے بھاگے۔ کبھی کسی پیڑ کے نیچے دبک رہتے، کبھی پھر آگے بڑھتے۔ بجلی چمکتی تو ایک دم سے جنگل جاگ اُٹھتا، اور پھر سپاٹ اندھیرا چھا جاتا۔

یکایک ہمارے سر آگے کسی روک سے ٹکرائے۔ شاید کوئی چٹان تھی۔ پھر بجلی کی چمک میں ہم نے دیکھا کہ کسی مکان کی دیوار ہے۔ ہماری جان میں جان آئی۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ مگر کبھی کبھی دُور بجلی چمک جاتی تھی۔ بادل ابھی تک گرج رہے تھے۔ ایک عجیب سی گرج تو بالکل قریب سے آئی۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ ہم جلدی جلدی ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھے۔

یہ مکان کوئی کھنڈر تھا۔ دروازہ آدھا ٹوٹا ہوا تھا ہم جلدی سے اندر گھُس گئے، کیوں کہ وہ گرج بادلوں کی نہیں تھی۔ یہ گرج ہم نے کئی بار سرکس میں سُنی تھی۔ اُس وقت کتنی شاندار لگی تھی۔ مگر اس وقت تو دہشت چھا گئی۔ شکر ہے اس وقت میں رونا پیٹنا بھول چکی تھی۔

چاند نہیں نکلا تھا مگر کچھ دُودھیا اُجالا پھیل چلا تھا۔ ہم نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ مکان کی چھت غائب تھی۔ گرج پھر سُنائی دی —— اور کافی قریب اور صاف، کیوں کہ اب بوندوں کی ٹپ ٹپ بھی کم ہو چکی تھی۔

جب ہماری آنکھیں کچھ اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو ہم نے دیکھا کہ ہم کسی گھر میں نہیں، بلکہ کسی پُرانے مندر کے کھنڈر میں ہیں۔ سامنے ایک اُونچے سے چبوترے پر شیو جی کی ایک بڑی سی مُورتی تھی، جس کا ایک ہاتھ غائب تھا، مگر اُن کی جٹاؤں میں سے نکلتے ہوئے سانپ کا پھن اُس شان سے اُٹھا ہوا تھا کہ میری گھگھی بندھ گئی۔ اب اُجالا بھی ہو گیا تھا، کیوں کہ چاند کے رُخ سے کبھی بادل ہٹ جاتے تھے اور کبھی باریک سی نقاب بن کر منظر کو ذرا تاریک اور ڈراؤنا بنا دیتے۔

اب کی بار گرج کے ساتھ غراہٹ بھی سنائی دی

اور اس کے ساتھ ہی دل ہلا دینے والی انسانی چیخ۔ بچے بھی کمال کرتے ہیں تماشا دیکھنے کے شوق میں خوف بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اینٹوں پر سے چڑھتے ہوئے ہم شوجی کی مورتی کا سہارا لیتے ملبے کے ڈھیر پر چڑھ گئے وہاں جو سین دیکھا تو ایک دفعہ تو ہم نیچے پھسلتے پھسلتے بچے۔

ایک پھرتیلا چیتا مندر سے ملے ہوئے پیڑ پر ایسے جھپٹ رہا تھا جیسے کوئی شریر لڑکا آم توڑنے کی کوشش کر رہا ہو وہ کسی آم پر لپک رہا تھا، یہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس ایک کالی سی ٹانگ اور سفید دھوتی نظر آ رہی تھی۔

ہم تینوں کے گلے سے نہ جانے کیسی ملی جلی چیخ نکلی۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے چیتا بوکھلا سا گیا اور جھاڑیوں میں بھاگ گیا۔ مگر پھر دبے پاؤں آکر جھانکنے لگا ــــ بالکل چوٹی بلی کی طرح۔

" آدمی ! " بے اختیار ہمارے مونہہ سے نکلا۔ ٹہنیاں ہٹا کر وہ ہمیں بے وقوفوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔

" بچاؤ " وہ گڑگڑایا۔

" ڈرو نہیں ! " ہم نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔ اس وقت ساری دشمنی، ساری شکایتیں ایک دم دل سے غائب ہو گئیں۔ ویسے ہم کون سے محفوظ تھے۔ اگر چیتا اُسے چھوڑ کر ہماری خبر لینے پر تل جاتا تو ہم بھی کوئی قلعہ میں نہیں تھے۔ دیوار پر اور ذرا سے چھت کے بچے ہوئے ٹکڑے پر تھے۔ مگر نسبتاً آدمی سے زیادہ محفوظ تھے، کیوں کہ چیتا پیڑ پر تو چڑھ سکتا ہے، دیوار پر نہیں چڑھ سکتا۔

نہ جانے اس وقت ہمیں کیا سوجھی۔ جیسے ہی چیتا دبکتا رینگتا نکلا، وہ ہمیں بڑا ڈرپوک اور پھس پھسا لگا چنو نے ایک گما اینٹ اُٹھا کر ماری۔ لگی تو کیا، مگر چیتا غرایا اور ٹھٹک گیا۔ لیکن لمحہ بھر ٹھہر کر وہ پھر لپکا۔ پیڑ کے قریب

دوست ــــ اب تو وہ تاریخ بتا دو
جب تم میرا قرضہ ادا کرنے کے قابل ہو جاؤ گے

پہنچ ہی جاتا اگر ہم تینوں نے اس پر پتھروں کی بارش نہ کر دی ہوتی۔ ساتھ ساتھ ہم بُری طرح چیخ بھی رہے تھے۔ آدمی بھی طرح طرح کی ڈراؤنی آوازیں نکال رہا تھا۔ چیتا جھنجھلا کر پھر جھاڑی میں چلا گیا اور وہیں سے غرانے لگا جیسے ہمیں گالیاں دے رہا ہو۔ اب تو خاصا مزہ آنے لگا اس کھیل میں۔ چاندپوری نشان سے دمک رہا تھا کہ جنگل کا پتہ پتہ گن لو۔

آدمی ہمیں رشک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا، کہ ہم نسبتاً محفوظ تھے اور ہمارے پاس اینٹ پتھر کی کمی نہ تھی۔ اُس کی لاٹھی تو چیتے کی پہلی ڈانٹ میں ہی نیچے ٹپک گئی تھی۔

" اے آدمی دیوار پر آ جاؤ "

" ہُوں ہُوں ہُوں . . . . کیسے ؟ " اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی، کیوں کہ چیتا پھر کھسک رہا تھا۔ پیڑ کی کچھ ٹہنیاں مندر کی دیوار تک آئی ہوئی تھیں مگر بہت

کم زور اور پتلی تھیں۔ لیکن اگر اس کے ہاتھ پیر قابو میں ہوتے اور ذرا چاق چوبند ہوتا تو اُوپر کی ڈال سے جھونکالے کر ہاتھ چھوڑ دینا اور کافی امکان تھا کہ چھت کے ٹوٹے ہوئے حصے تک پہنچ جاتا۔ ویسے تو چھت بھی بہت کم زور ہو چکی تھی۔ بس ایک کونا تھا۔

چیتا درخت کے پاس پہنچنے کی متواتر کوشش میں تھا، مگر کچھ ہماری چیخیں، کچھ پتھروں کی بارش اُسے کچھ تکلف ہو رہا تھا۔ لیکن شاید بھوکا تھا، اس لئے بے حد جھنجھلا رہا تھا۔

ہم بھی کچھ کم بھوکے نہیں تھے۔ تھکن سے چُور، چلّاتے چلّاتے آواز بیٹھی جا رہی تھی۔ سوچ رہے تھے کب تک ہم اینٹوں اور چیخوں سے اُسے روکیں گے۔ بڑا چالاک جانور ہوتا ہے چیتا۔ اُسے شاید معلوم ہو گیا تھا کہ ہم بچ کر نہیں جاسکیں گے۔

مگر اب اس سے زیادہ انتظار نہ ہو سکا۔ کچھ ہماری اینٹوں کی رفتار میں بھی کمی آئی۔ وہ بے دھڑک تنے تک پہنچ گیا اور پیچھے سے چڑھنے لگا ـــــ ایسے کہ ہمیں دکھائی بھی نہ دیا۔

آدمی کی عقل بالکل گم ہو گئی۔ جب چیتا اُس تنے پر آیا جس کے سِرے پر آدمی تھا تو آدمی کے ہاتھ پیر بے سُدھ ہو گئے۔ ہم تو سمجھے اب ٹپکا اور اب گرا۔ مگر اسی وقت نہ جانے کیوں چیتا کچھ ٹھٹھکا۔ شاید تنا پتلا تھا اور اس کا بوجھ نہیں سہار سکتا تھا، عجیب سماں تھا۔ اب تک کبھی سوچتی ہوں تو پیٹھ پر کھنکھجورے رینگنے لگتے ہیں۔ اُدھر سے چیتا سانپ کی طرح رینگتا کھسک رہا تھا۔ اِدھر آدمی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور میں ایک ٹوٹی ہوئی بُرجی سے چپکی ہوئی بیٹھی یہ سب کچھ تک رہی تھی۔ مگر ثنا اور جینو متواتر چلّا رہے تھے اور اندھا دُھند اینٹ پتھر اِدھر اُدھر پھینکے جا رہے تھے۔

جب موت قریب کھسکنے لگی تو آدمی مرتا کیا نہ کرتا، منڈر کی چھت پر کودنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مگر چیتے کو جیسے اُس کی نیت کا پتہ چل گیا۔ جب کبھی میں جامن کا پیڑ دیکھتی ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر اب یہ سوچتی ہوں کہ اگر وہ پیڑ جامن کا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ سب کچھ بجلی کی سی تیزی سے ہوا۔ اِدھر آدمی نے جھونکا لیا، اُدھر چیتے نے شکار کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر چھلانگ ماری۔ ایک دردناک چیخ مار کر گدھا چرچرایا ـــــ اور دونوں اُڑاڑا دھم ـــ نیچے۔

اس کے ساتھ ہی تڑاق تڑاق بندوق کے فیر سنائی دئے اور چیتا ڈھیر ہو گیا۔

یہ سب مجھے بعد میں بتایا گیا، کیوں کہ میں تو وہاں ٹوٹی ہوئی بُرجی سے لپٹی جانے سو گئی کہ بے ہوش ہو گئی۔ زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ مجھے اتنی زور کا ڈنڈنا کے بخار چڑھا کر جب مجھے ہوش آیا تو نہ ڈانٹ پڑی نہ مور کے بچّوں کی دُھن میں کسی اجنبی کے ساتھ جنگل میں جانے پر پٹائی ہوئی۔ ہمیں اتنی سزا مل چکی تھی کہ اب اور زیادہ کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ ثنا اور جینو بھی ستے نہیں چھوٹے۔ جینو کو بخار تو دو ہی دن آیا مگر گھٹنے کا زخم ایسا خراب ہوا کہ ٹانگ ـــ کٹنے کی نوبت آ گئی۔

ثنا صاف کورا بچ گیا اور اپنی بہادری کے ڈھول پیٹتا رہا۔ اُس آدمی کو سارا قصّہ سُن کر ابا میاں نے معاف کر دیا اور شہر کے دفتر میں نوکر کرا دیا۔

اور اس قصّے کے بعد "مور کے بچّے" ہماری چڑ مقرر کر دی گئی۔ جب ذرا شرارت کرتے یہی دھمکی دی جاتی کہ کیا مور کے بچّے دیکھنے کی صلاح ہے۔

اور کمال ہے کہ میں نے آج تک ـــ "مور کے بچّے" نہیں دیکھے!

●●

آپا ٹاپا

جاؤ، میں تم سے نہیں بولتی —— آپا ٹاپا!!

●

دیکھو تو —— نام مرا رکھا ہے "لِلّی گھوڑی"
کبھی کھینچی مری چوٹی —— کبھی چوڑی توڑی

کبھی گردن مری ناپی —— کبھی سر کو ناپا
جاؤ، میں تم سے نہیں بولتی —— آپا ٹاپا!!

●

پھول بھی چھین لیا —— پین بھی چرایا میرا
خود گھڑا پھوڑ دیا، نام لگایا میرا

ایک گھنٹے سے مجھے ڈانٹ رہے ہیں پاپا
جاؤ، میں تم سے نہیں بولتی —— آپا ٹاپا!!

●

مجھ سے لڑنے کے لئے یوں تو بہت کافی ہو
پیار کرتی ہو —— مرے پاس اگر آتی ہو

ایسے موقع پہ جتاتی ہو بہت بہناپا
جاؤ، میں تم سے نہیں بولتی —— آپا ٹاپا!!

شبنم رومانی

بچوں کی دنیا

کنہیالال کپور

کتاب کا آخری فقرہ تھا: "جب تک سب لوگ بچوں کی طرح سادہ دل اور معصوم نہیں بن جاتے، زمین پر اندھیرا چھایا رہے گا۔" پروفیسر یوسف نے جب یہ فقرہ پڑھا تو وہ چونک پڑے اور بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا "واقعی مصنف نے لاکھ روپے کی بات کہی ہے۔" اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اندر آنے کی اجازت ملنے پر ان کا پرانا ہم جماعت اصغر داخل ہوا۔ اصغر نے فلسفے کے مضمون میں ایم اے کیا تھا، اور آج کل اس موضوع پر ریسرچ کر رہا تھا کہ بچے کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں۔ پروفیسر یوسف نے اصغر سے اُس فقرے کا ذکر کیا۔ جو ابھی ابھی اُنہوں نے پڑھا تھا۔ اصغر نے فقرہ سنتے ہی ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا: معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کا مصنف بچوں کی طرح سادہ دل اور معصوم ہے، ورنہ وہ ایسی بات کبھی نہ کہتا۔"

پروفیسر یوسف نے حیران ہو کر پوچھا "تمہارا مطلب"

اصغر نے مسکرا کر جواب دیا "اُس مصنف نے کبھی چھپ کر بچوں کی باتیں نہیں سُنیں۔ یہ بچے تو بڑے بڑوں کے کان کاٹتے ہیں ـــ"

پروفیسر یوسف نے سوال کیا "کیا تم نے کبھی چھپ کر بچوں کی باتیں سُنی ہیں؟"

اصغر نے کہا "جی ہاں۔ اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی سنا سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

مجھے ایک موقع اور دو، آج میری ممی میچ دیکھنے آئی ہوئی ہیں

"اس مشین کے ذریعے جسے ٹیپ ریکارڈر کہتے ہیں، اور جسے میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔"

"اچھا تو ہم بھی ذرا سنیں کہ بچے کیا کہتے ہیں؟"

"ضرور سنئے۔" اصغر نے ٹیپ کا بٹن دبایا، تھوڑی دیر کے بعد اس سے یہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"میں کہتا ہوں یار خدا جانے ان طلبا کو کیا ہو گیا ہے، ہر روز مردہ باد، مردہ باد کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔"

"میرے خیال میں یہ اپنا سبق یاد کر رہے ہیں۔"

"جیسے ہم پہاڑے یاد کیا کرتے ہیں۔"

"سبق یاد نہیں کر رہے ہیں۔ زور زور سے چلّانے کی مشق کر رہے ہیں۔"

"یہ امتحان کیسے پاس کریں گے؟"

"شاید یہ ہر سوال کے جواب میں لکھیں گے۔ مردہ باد۔"

"پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔"

"جی ہاں۔ سوال ہو گا آبادی کے لحاظ سے کون سا شہر بڑا ہے، الہ آباد یا حیدر آباد؟ جواب ہو گا۔ مردہ باد!"

"سوال ہو گا: "ناشاد" کے کیا معنی ہیں؟"

"جواب ہو گا، مردہ باد!"

"یہ والدین بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے نا، قصور ڈیڈی کا تھا۔ اُلٹا مجھے سخت سُست کہنے لگے۔"

"بات کیا ہوئی تھی؟"

"ڈیڈی نے ہم سے کہا تھا، جب فلاں شخص ملنے کے لئے آئے تو اُس سے کہنا میں گھر پر نہیں ہوں۔"

"پھر؟"

"جب وہ شخص آیا تو ہم نے کہا "ویسے تو ڈیڈی گھر پر ہی ہیں، لیکن وہ آپ سے ملنا نہیں چاہتے۔"

"اس قسم کا واقعہ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا۔ آج ایک ہمسائی ممی سے آئس کریم بنانے والی مشین مانگنے آئی۔ ممی نے کہا، ہماری مشین فلاں عورت لے گئی ہے، ہم نے فوراً کہا، ممی آپ جھوٹ کیوں بول رہی ہیں۔ مشین تو اندر پڑی ہے۔ ہمسائی کے چلے جانے کے بعد ممی نے ہماری وہ خبر لی کہ توبہ ہی بھلی۔"

"ہمارے بڑے بھائی صاحب بھی تمہاری ممی سے کم نہیں۔ کل اُنہوں نے بُری طرح ہمارے کان اینٹھے۔"

"تمہارا قصور؟"

"ہمارا قصور یہ تھا کہ تم نے ڈیڈی کو کیوں بتایا کہ جو پیسے بھائی صاحب نے کتاب خریدنے کے بہانے اُن سے لئے تھے، اُن سے اُنہوں نے فلم دیکھی تھی۔"

تمہارے ابا تو بالکل بدھو ہیں ــــ کسی سے رشوت نہیں لیتے۔

رشوت لینا تو جرم ہے۔ اگر آدمی پکڑا جائے تو؟"

" تو کیا؟ رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہے "

" دُنیا کتنی بدل گئی، لیکن ہم ابھی تک وہی گھسے پٹے محاورے استعمال کر رہے ہیں "

" مثال کے طور پر چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ حالانکہ چاند نہایت بدصورت ہے "

" اور ہاں، سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ حالانکہ آج کل کون سر منڈاتا ہے؟"

یہ بڑے جو باتیں خود کرتے ہیں، ہمیں کیوں نہیں کرنے دیتے۔ ہمارے ایک بزرگ ہمیں ہر روز سمجھاتے ہیں۔ کسی کو گالی نہ دو، اور خود نوکروں کو اتنی گالیاں دیتے ہیں کہ کوئی سُنے تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔ ہر شخص کو " سالا " کہنا تو گویا اُن کا تکیۂ کلام ہے "

" ابا جان ہمیں ہمیشہ نصیحت کرتے ہیں، صبح سویرے اُٹھا کرو۔ حالانکہ خود کبھی دس بجے سے پہلے نہیں اُٹھتے "

یہ غلط ہے کہ صرف بچّے روٹھا کرتے ہیں۔ جب کبھی پتاجی اور ماتاجی آپس میں لڑتے ہیں، ہفتوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے "

یہ بھی غلط ہے کہ صرف بچّے ضد کیا کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بھائی صاحب تین سال سے ضد کر رہے ہیں کہ جس لڑکی سے اُن کی سگائی ہوئی تھی اس کے ساتھ شادی نہیں کریں گے "

کون کہتا ہے کہ صرف بچّے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں۔ ہمارے محلّے میں دو ہمسائے جو بچے نہیں، کبھی اس بات پر لڑتے ہیں کہ اُن میں سے ایک اپنے کو شاعر کیوں سمجھتا ہے۔ اور کبھی اس بات پر کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ گنجا ہے "

" ہماری گلی میں دو عورتیں آئے دن اس بات پر لڑتی ہیں کہ ایک نے اپنے لڑکے کی سگائی پر دوسری کو آٹھ لڈّو بھجوائے تھے، لیکن دوسری نے اپنے لڑکے کی سگائی پر پہلی کو صرف چار لڈّو کیوں بھجوائے؟"

بچّے اتنے وہمی اور ناسمجھ نہیں ہوتے جتنے بڑے ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک امیر رشتے دار کو کوئی مرض نہیں۔ پھر بھی وہ کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں اور مجھے دنیا کا کوئی ڈاکٹر اچھا نہیں کر سکتا "

" ہمارے ماموں جان کو شعر کہنا بالکل نہیں آتا لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اقبال سے بڑے شاعر ہیں "

آئیے میں آپ کو مہمانوں کا خصوصی کمرہ دکھاؤں

"ہماری بھابی کہتی ہیں کہ میں ہر سال اس لئے بی اے میں فیل ہو جاتی ہوں، کیوں کہ مجھے میرے پروفیسروں کی نظر لگ جاتی ہے۔"

"یہ صحیح نہیں کہ بچے ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ ہم سے جو بڑے ہیں وہ کم ڈھیٹ نہیں۔"

گاندھی جی کہتے ہیں: ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی آپس میں ہیں بھائی بھائی۔ وہ جواب میں کہتے ہیں:
"ہندو، ہندو ہیں۔ مسلم، مسلم۔ سکھ، سکھ۔ عیسائی، عیسائی۔ بھائی بھائی کوئی نہیں۔"

یہ محض وہم ہے کہ صرف بچے روتے ہیں۔ ہم نے تو عموماً بڑی عمر کے ہر شخص کو روتے ہوئے دیکھا ہے۔"
"ہاں کوئی اس لئے روتا ہے کہ اس کے پاس صرف بائیسکل ہے۔ جب کہ اُس کے ہمسائے کے پاس اسکوٹر ہے۔"
"اور کوئی اس لئے روتا ہے کہ وہ ملازم تو ہے لیکن افسر نہیں۔"
"اور کوئی اس لئے روتا ہے کہ اس کے بال کیوں سفید ہو گئے ہیں؟"

اصغر نے ٹیپ ریکارڈ بند کیا اور پروفیسر یوسف سے پوچھا "اب آپ کا اس فقرے کے متعلق کیا خیال ہے؟"
پروفیسر یوسف نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "اب تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمام لوگ بچوں کی طرح ہیں، بلکہ بچوں سے بدتر ہیں۔ اور دنیا میں اُس وقت تک اندھیرا چھایا رہے گا جب تک وہ بچوں سے بہتر نہیں بن جاتے!"

مُنّا

شمیم کرہانی

مرا منّا جواں ہوگا
نئی دُنیا بسائے گا
اندھیروں کو مٹائے گا
چراغِ خانماں ہوگا
مرا منّا جواں ہوگا

ابھی نازک سی ہے کونپل
مگر تم دیکھ لینا کل
چمن کا باغباں ہوگا
مرا منّا جواں ہوگا

ابھی ننھا سا ہے رہرو
مگر کہتی ہے دل کی لَو
کہ میرِ کارواں ہوگا
مرا منّا جواں ہوگا

لگا دوں آنکھ میں کاجل
کہ یہ ننھا سپاہی کل
وطن کا پاسباں ہوگا
مرا منّا جواں ہوگا

کل اس کی چاند سی دلہن
جب آئے گی مرے آنگن
تو گھر رشکِ جناں ہوگا
مرا منّا جواں ہوگا

میرے بال کاٹنے کے لئے
زیادہ اجرت کیوں؟
کیوں کہ مجھے
خوردبین سے دیکھ
بال کاٹنے پڑیں گے

مچھلی
(تیغی بازشکاریوں کے لئے)

میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ
ٹھوڑی پر اس کا مکا نہ
پڑنے دینا۔

باقی پروگرام اسکول
کا کام پورا کرنے کے بعد

بہترین استری کیجئے
سوٹ ....
کوٹ ....

سفری بیگ
یہ کیسے سفری بیگ
ہیں؟ آدھے گھنٹے سے میں
انہیں دیکھ رہا ہوں پر
ہلتے تک نہیں۔

ایک ستارہ
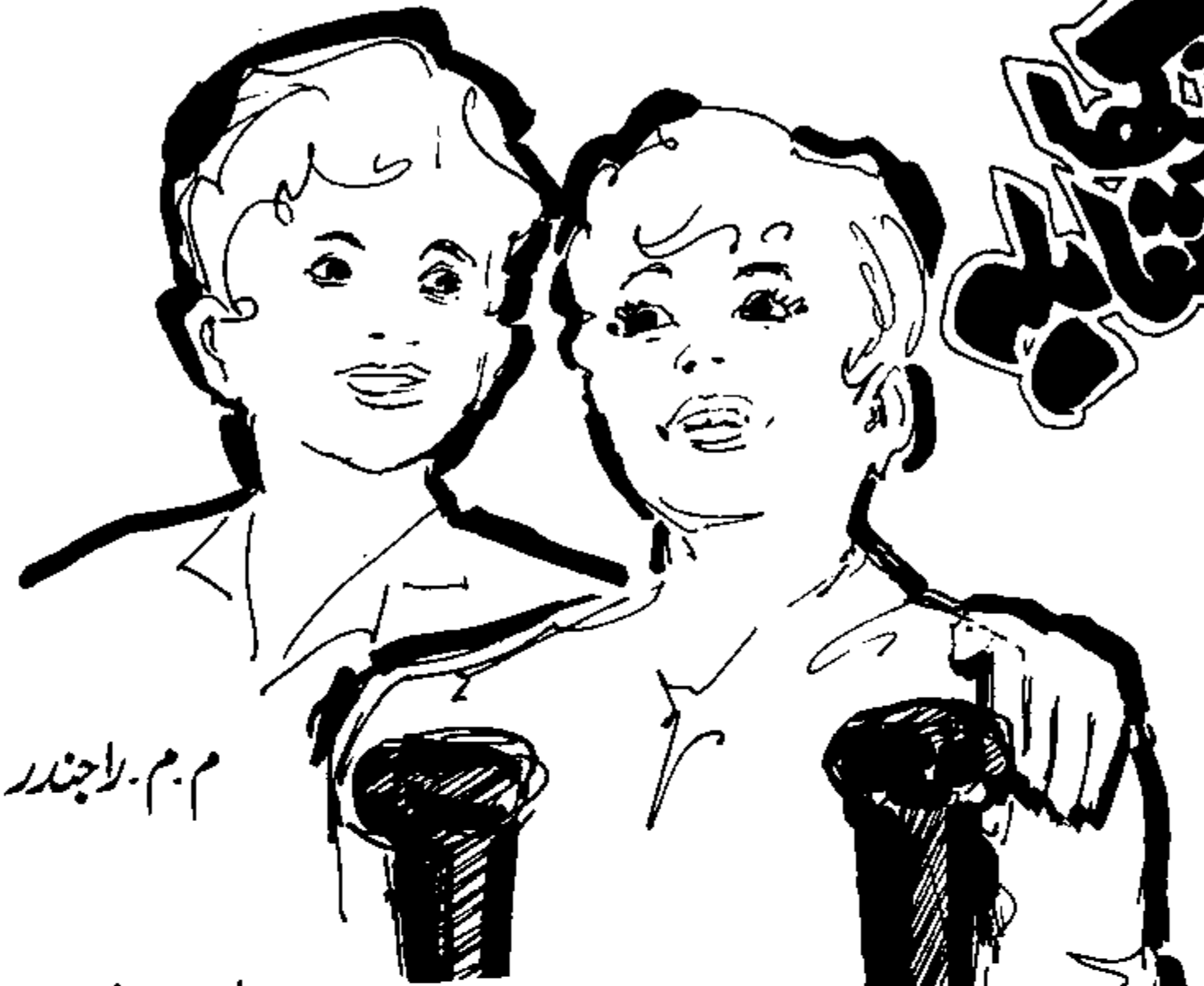
م.م. راجندر

جب سلیم اپنے ابا کے ساتھ چھٹی کلاس میں داخل ہوا تو ساری کلاس کی نظریں اس پر جم گئیں۔ بہت سے بچے تو اچک اچک کر دیکھنے لگے۔ ماسٹر جنید نے ایک لڑکے کو پیچھے بھیج کر سلیم کو دروازے کے پاس ہی والے ایک ڈیسک پر رمیش کے ساتھ بٹھا دیا۔ جب سلیم بیٹھ گیا اور اس کے ابا ماسٹر جنید سے بات کر کے چلے گئے تو ماسٹر جنید کلاس کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"بچو! آج سے تمہارے ساتھ تمہارا ایک نیا ساتھی اور دوست سلیم شامل ہو گیا ہے۔ جب سلیم کمرے میں داخل ہوا تو تم سب اس کی طرف کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے، کیوں کہ وہ بیساکھیوں کے سہارے چل رہا تھا۔ پھر وہ تمہارے سامنے ہی دروازے کے باہر رکھی ہوئی اپنی پہیے لگی ہوئی کرسی پر سے اترا تھا۔ یہ کرسی دراصل سلیم کی سائیکل ہے اور سلیم اس پر

بس. بس. اب چپّو چلانا بے کار ہے

بیٹھ کر اور اسے ہاتھ سے چلا کر اِدھر اُدھر جا سکتا ہے۔ سلیم پہلے لکھنؤ میں پڑھتا تھا اور اب اس کے ابّا کا تبادلہ یہاں کا ہو گیا ہے۔ سلیم کے ابّا نے گھر سلیم کی وجہ سے اسکول کے بالکل پاس لیا ہے تاکہ سلیم اپنے آپ اپنی سائیکل پر اسکول آجا سکے۔ سلیم کے بارے میں یہ بھی پتہ لگا ہے کہ پڑھائی میں ہوشیار ہے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"لیکن ماسٹر صاحب" تنکر نے کھڑے ہو کر پوچھا "سلیم ہم سب کی طرح کیوں نہیں چلتا۔ اُسے اِن پہیوں اور کرسی کی کیا ضرورت ہے۔"

ماسٹر جنید سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر انہوں نے سلیم کی طرف دیکھا اور اُسے مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرا دیئے۔ کہنے لگے،

"جو سوال تنکر نے پوچھا ہے وہ دوسروں کے دل میں بھی ہوگا۔ میں خود اس کا جواب دینے والا تھا۔ بچّو، سلیم بے چارہ پولیو کا مریض ہے، جس کی وجہ سے وہ چلنے سے معذور ہے۔ سلیم کی طرح اور بھی بچّے ہمارے ملک میں، بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ہیں۔ لیکن بچّو ایک بات یاد رکھنا۔ معذوری یعنی اپاہج ہوجانا مجبوری نہیں ہے۔ انسان کی ہمّت ناقابلِ تسخیر ہے یعنی اسے کوئی نہیں فتح کر سکتا۔ ہم ہمّت اور حوصلے سے بڑی سے بڑی مجبوری پر قابو پا سکتے ہیں اور سلیم جیسے بچّے اس کی مثال ہیں۔"

"ماسٹر صاحب" رتیش اُٹھ کر بولا "اسی ہمّت اور حوصلے کی وجہ سے تو آج آدمی چاند تک پہنچ رہا ہے۔"

"شاباش رتیش، تم نے بالکل ٹھیک کہا۔"

ماسٹر جنید نے یہ کہہ کر انگریزی پڑھائی شروع کر دی اور کلاس میں پھر خاموشی چھا گئی۔

چھٹی کلاس میں ایک اور ہوشیار لڑکا اصغر تھا۔ پانچویں جماعت میں فرسٹ آیا تھا۔ اصغر ہوشیار تو تھا مگر مغرور بھی تھا۔ دراصل اُس پر بُرا اثر ایک اور لڑکے جسونت کا پڑ رہا تھا۔ جسونت پڑھائی میں صفر تھا مگر ڈیل ڈول کا تھا۔ کلاس کے سب لڑکے اس سے ڈرتے تھے۔ اُسے نقل مارنے کی عادت تھی اور اس کے لئے اس نے اصغر سے دوستی کر لی تھی۔ وہ ہر روز گھر سے پیسے لاتا تھا اور اصغر کو بھی کھلاتا پلاتا رہتا تھا۔ ایک دن جب وہ دونوں اسکول کے باہر گول گپے کھا رہے تھے تو جسونت نے کہا "یار اصغر ماسٹر جنید تو اس لنگڑے کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنے مضمونوں انگریزی اور حساب میں تو اُسے ہی پہلا نمبر دیں گے، اور بچّو تو رہ جائے گا۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔" اصغر بولا "کوئی ٹیچر ایسا نہیں کرتا اور ماسٹر جنید تو اس اسکول کے بہترین ٹیچر ہیں۔"

"ابے رہنے دے اپنے لیکچر کو۔ میں نے خود ماسٹر جنید اور سلیم کے ابّا کو کئی دفعہ اسکول کے باہر بات کرتے دیکھا ہے۔ تو نے ایک بات نوٹ نہیں کی۔ ماسٹر جنید کو اب کچھ بھی پوچھنا ہو تو پہلے لنگڑے سے ہی پوچھتے ہیں۔ تیری وہ بات نہیں

کلاس میں؟"

"میرا خیال ہے ماسٹر جی ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ سلیم کو ہم سب کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔" اصغر بولا۔

"ابے بڑا گُھنّا ہے وہ لڑکا۔ میں نے اُسے خود ماسٹر جی کی تعریف کرتے سُنا ہے اور وہ رمیش تو بالکل اس کا نوکر بن گیا ہے۔ جب دیکھو لنگڑے کا کوئی نہ کوئی کام کر رہا ہے۔ ہر روز اُسے کُرسی پر سے اُتارتا اور بٹھاتا ہے اور ایک دن تو اسکول کے دروازے تک اس کی کُرسی خود ہی دھکیل کر لے گیا۔ خیر چھوڑ ان باتوں کو۔ کل چھٹی ہے۔ تین بجے کے شو میں پکچر چلیں گے! بڑی مار دھاڑ کی فلم ہے۔ مزہ آجائے گا۔"

"مگر سہ ماہی امتحان بھی تو اب ہونے والے ہیں۔"

"ابے ابھی تو دس دن پڑے ہیں۔ ایسا کیجیو۔ گھر سے یہ بہانہ بنا کہ کے آجانا کہ باغ میں لڑکے اکٹھے پڑھنے جا رہے ہیں۔ تو پکّی ہے نا؟"

اصغر نے مجبور ہو کر ہاں کر دی۔

اُدھر سلیم کسی مقابلے کی خواہش سے بے نیاز اپنی پڑھائی میں لگا ہوا تھا۔ رمیش صرف ہمدردی کے جذبے میں سلیم کو اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے میں مدد کر رہا تھا۔ سلیم اسے روکتا بھی تھا، مگر رمیش اُسے اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اور پھر سلیم اُس کے ڈیسک کا ساتھی بھی تو تھا۔ سلیم رمیش کی پڑھائی میں مدد کر رہا تھا اور ایک دوسرے کے لئے اس جذبے نے انہیں سچے دوست بنا دیا تھا۔ یہ دوستی جسونت اور اس کے ساتھیوں کو ایک آنکھ نہیں سہا رہی تھی۔

کلاس میں اچھے اور بُرے سب ہی طرح کے لڑکے ہوتے ہیں۔ مگر رمیش کو بہت ہی دُکھ ہوتا جب سلیم کو کوئی لنگڑا لولا کہہ کر پکارتا۔ کچھ لڑکے تو سلیم سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے۔ اس لئے سلیم کلاس میں تنہا تنہا، کٹا کٹا سا رہتا تھا۔

ڈیڈی، آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ سنبھل سنبھل کر زینے سے اترا کیجئے

مگر رمیش کا ساتھ اور اس کی سچی دوستی اس تنہائی کو محسوس تک نہ ہونے دیتی۔ سلیم کو کوئی کچھ بھی کہہ دے، وہ بُرا نہ مانتا تھا۔ وہ تو ہر وقت مُسکراتا رہتا اور اپنی پڑھائی میں دل لگائے رکھتا۔ وہ صاف ستھرا رہتا اور اچھے کپڑے پہنتا تھا۔ وہ سب کی عزت کرتا تھا اور سب سے ہنس کر بولتا تھا۔ اُستادوں کا اور بڑوں کا وہ خاص طور پر ادب کرتا تھا۔

سہ ماہی امتحان میں اصغر ہی اوّل آیا۔ سلیم کا نمبر تیسرا تھا۔ مگر سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ رمیش بھی اعلیٰ نمبر حاصل کرنے والے پہلے سات لڑکوں میں تھا۔ اس کی سب سے زیادہ خوشی سلیم کو ہوئی۔ رمیش جانتا تھا کہ اُس کی اعلیٰ کامیابی میں سلیم کا کتنا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کی اور سلیم کی دوستی اور زیادہ پکّی ہو گئی۔

کلاس میں اس کے بعد جو امتحان یا ٹیسٹ ہوئے اُس میں کسی مضمون میں اصغر فرسٹ آجاتا اور کسی میں سلیم۔ مجموعی طور پر بھی ان دونوں کے نمبروں میں کوئی خاص فرق نہ رہتا۔ دراصل جہاں سلیم نے ہر امتحان میں کچھ بہتر نمبر حاصل کئے

وہاں اصغر نے کچھ کھو دیے اور اس طرح سے یہ فرق کم ہوتا چلا گیا۔ اس کے علاوہ اصغر جسونت کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگا تھا اور پڑھائی سے بے پروا ہو گیا تھا۔ سلیم کے مقابلے میں وہ بلاشبہ کہیں زیادہ ذہین تو تھا مگر مغرور ہونے کے باعث بعض دفعہ بڑا بول بولنے سے بھی نہ چوکتا۔ سالانہ امتحان نزدیک آنے جا رہے تھے۔ اور وہ یہ اعلان کرنے لگا تھا کہ وہ یقیناً فرسٹ آئے گا اور اگر کسی مائی کے لال میں ہمت ہے تو اس کا مقابلہ کرلے یا شرط لگالے۔ جسونت کے بار بار کہنے سے اور پچھلے نتیجوں کی بنا پر اصغر یہ بھی یقین کرنے لگا تھا کہ ماسٹر جنید سلیم کو جان کر اپنے مضمونوں میں زیادہ نمبر دیے رہے ہیں۔ مگر سالانہ امتحان کے پرچے دوسرے ماسٹر صاحبان دیکھیں گے اور اس لئے وہ یہ چیلنج دے رہا ہے۔

یہ ایک طرف ذہانت مگر بدنیتی، بے پروائی اور غرور اور دوسری طرف محنت، صداقت اور حوصلے کا مقابلہ تھا۔

یہ مقابلہ جب بھی اس دنیا میں لاکھوں، کروڑوں بار ہوا، فتح محنت، صداقت اور حوصلے ہی کی ہوئی اور اصغر اور سلیم کے مقابلے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ سلیم امتحان میں اوّل آیا۔ اصغر اُمید کے خلاف پانچویں نمبر پر تھا اور اس کا ساتھی جسونت فیل ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی تو اس بات پر تھی کہ رمیش بھی اصغر سے بازی لے گیا تھا اور دوسرے نمبر پر تھا۔ مگر ریاضی اور انگریزی کے استاد، ماسٹر جنید اس نتیجے پر حیران نہیں تھے وہ اسکول کے احاطے میں مسکراتے ہوئے اور دوستوں سے گھرے ہوئے سلیم اور رمیش کے پاس پہنچے اور مسکرا کر بولے، "شاباش سلیم اور رمیش تم دونوں نے ثابت کر دیا کہ محنت اور صدق دلی سے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اور بیٹے رمیش تمہیں اللہ نے تمہاری نیکی کا صلہ بھی دیا ہے۔"

سلیم اور رمیش خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اچانک سلیم اپنی بیساکھیوں کے سہارے کرسی پر سے اُتر کر تن کر کھڑا ہو گیا اور جوش میں بولا، "ماسٹر جی کامیابی اور نتیجہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے مگر ہمارا فرض تو حوصلے، ہمت اور لگن سے کام کرنا ہے۔ میں آپ کے سامنے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اصغر میرا بھائی ہے۔ میں نے اُس کے بارے میں کبھی کوئی بُری بات نہیں سوچی اور نہ کبھی سوچوں گا۔ ہم سب پڑھنے والے بچے بھائی بھائی ہیں۔"

ماسٹر جنید کا چہرہ مسرت سے تمتما اُٹھا۔ انہوں نے سلیم کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے دعا دی۔ رمیش نے اپنے سہارے سے سلیم کو اُس کی پہیے دار کرسی پر بٹھا دیا اور بچوں میں گھرا ہوا سلیم اپنی کرسی کو دھکیل کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن آج صرف رمیش کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ بہت سے ہاتھ خوشی سے سلیم کی کرسی کو دھکیل رہے تھے۔

ان ہاتھوں میں دو ہاتھ اصغر کے بھی تھے۔ ■■■

نوشہ میاں

اُردو کے ایک شاعر غالب ہوئے تھے پیدا
صد سالہ جشن اُن کا دُنیا منا رہی ہے
علم و اَدب کا پرچم، اونچا کیا جہاں میں
ہندوستاں کی عظمت بس جگمگا رہی ہے
غالب کا نام لے کر جن کو جہاں پکارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے

اُردو زباں کا ایسا اِک دیپ جگمگایا
اِک سادگی زباں میں ہے آئینے کی صورت
اِک خوش مزاج انساں کیسا ذہین نکلا
علم و ادب کی پوری کر دی ہے سب ضرورت
جس کے کلام میں ہیں کچھ قیمتی اشارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے

نہرو تھے ایک چاچا اور دوسرے تھے غالب
دُنیا کا بچہ بچہ ، دونوں کو جانتا ہے
لیڈر تھے اِک وطن کے اور دوسرے تھے شاعر
جدّوجہد کو ان کی ہر شخص مانتا ہے
عِلم و ہنر کے سورج. دھرتی کے ماہ پارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے

موتی سے جَڑ دیتے ہیں الفاظ بولتے ہیں
کلیوں کا رنگ ڈھل کر پھولوں میں خوشنما ہے
گلکاریاں چمن کی ، نازِ بہار دیکھو!
ان کا کلام سچ مچ اِک روحِ گلستاں ہے
سر سبز کیاریوں میں جھل مل ہوتے نظارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے

خضر برنی
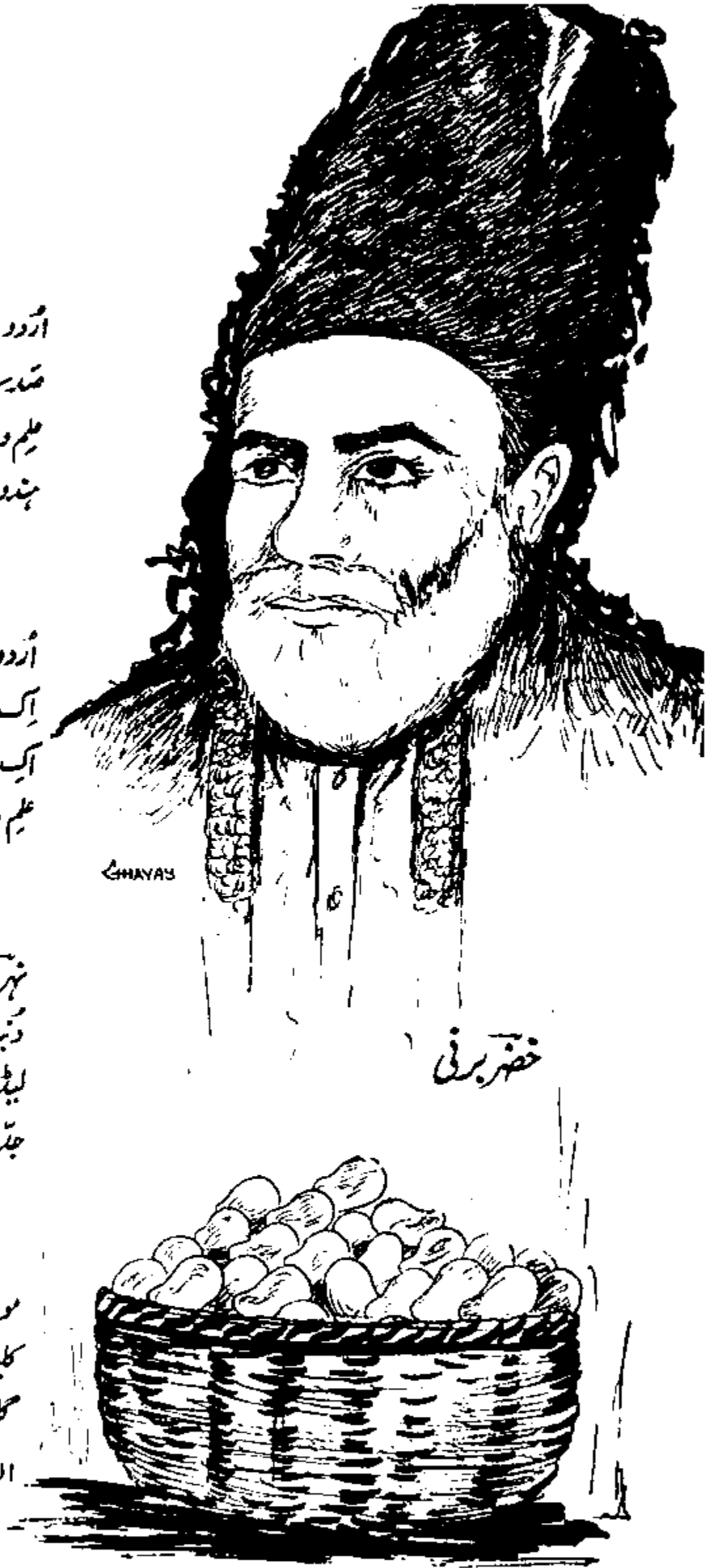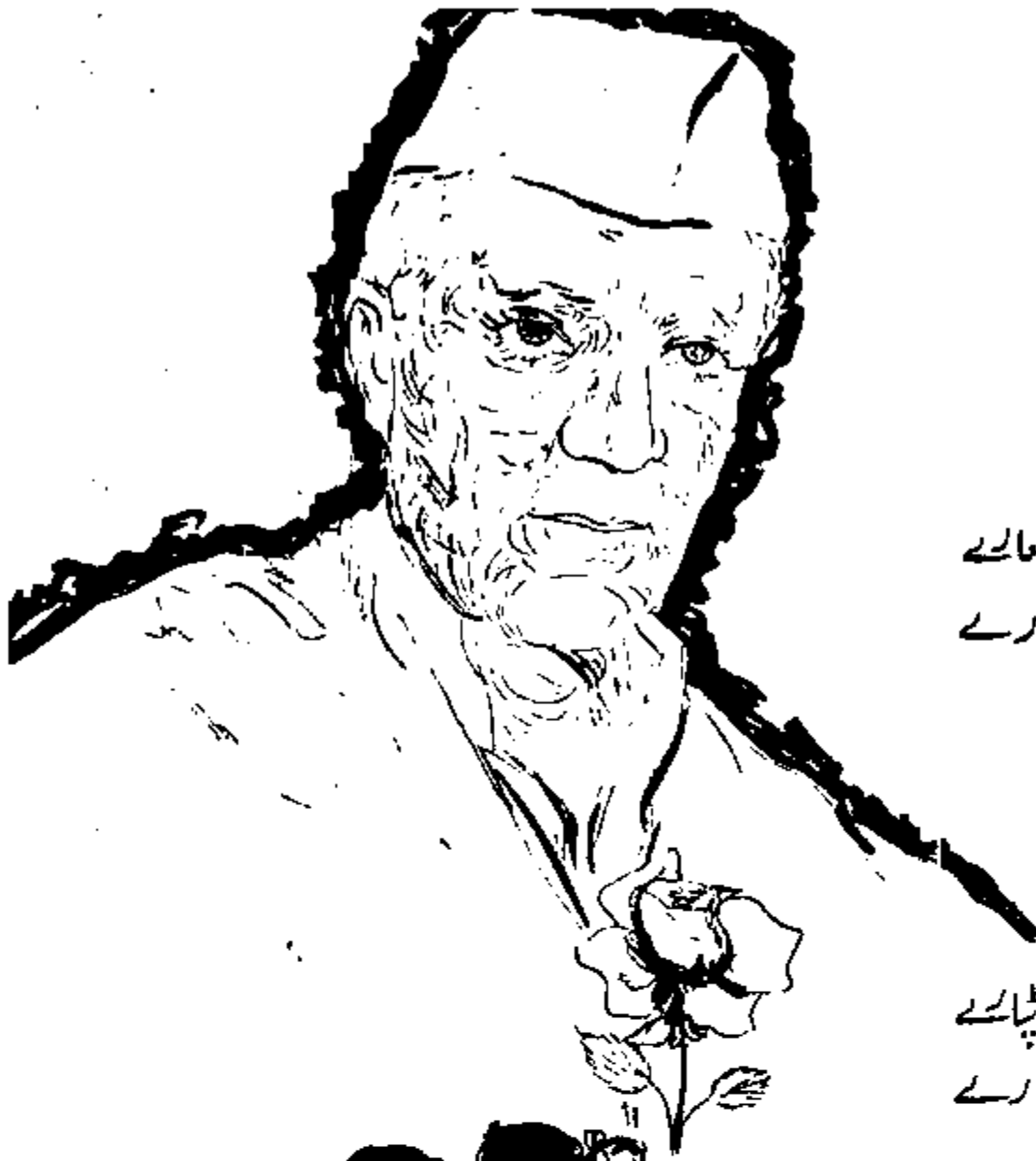
کچھ واقعات اپنے کچھ مرحلے جہاں کے
حالاتِ حاضرہ ہیں، کچھ فلسفے کی باتیں
اِک بات ہے کہ غالب اپنی جگہ ہیں غالب
نظم و نثر میں اِن پر لکھی گئیں کتابیں
اِن کے کلام میں ہیں کچھ ایسے استعارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے

موسم میں آم ان کی مرغوب اک غذا تھی
لنگڑا ہو یا کہ قلمی، چونسہ ہو یا ٹیکاری
گولا ہو یا کہ فضلی یا نسل دوسری ہو
ویسے بہ شوق ان کو مرغوب تھی دسہری
بارش میں خوب کھاتے بھر بھر کے وہ پٹارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے

کاغذ کی تہ میں ایسا اک پیار بھر دیا ہے
لفظوں میں دِلکشی کی بس شان ہے نرالی
غزلوں میں دیکھئے تو گوہر چھپے ہوئے ہیں
سادہ ڈگر پہ چل کر اِک راہ یہ نکالی
جیسے کہ مِل رہے ہوں گنگ و جمن کے دھارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے

طنز و مزاح بھی دیکھا اِک سادگی بھی پائی
اُن کے خطوط میں تو انداز ہی نیا ہے
کچھ پیار کا چلن ہے کچھ دلربا تخاطب
نظم و نثر میں ایسا پیغام بھر دیا ہے
نوکِ قلم سے ایسے ٹانکے گئے ستارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے
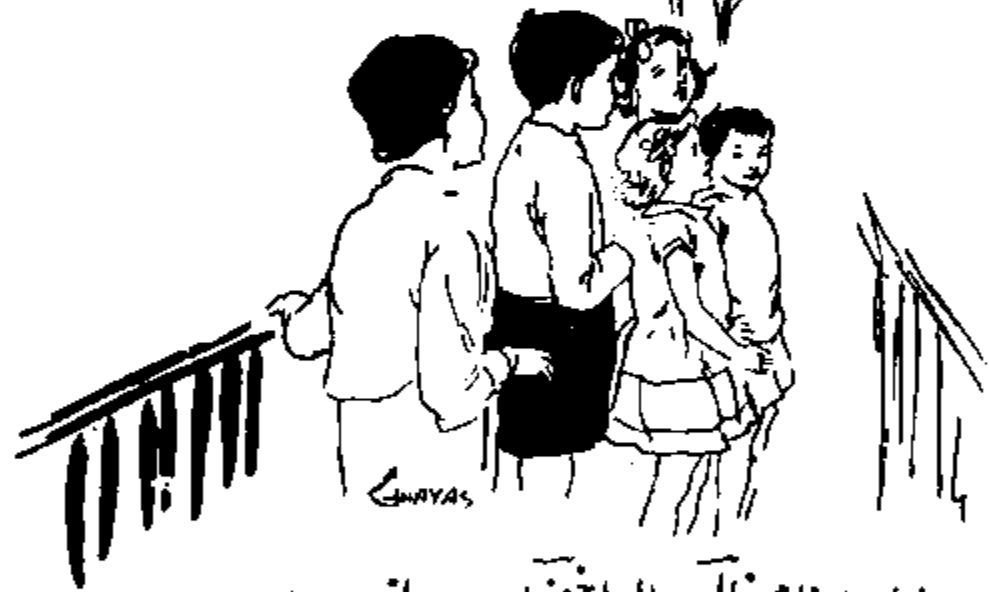
پایا ہے نام غالب ایسا خضر اسد نے
اونچا کیا ہے جس نے نام و نشاں ہمارا
مشرق ہو یا کہ مغرب ہر سُو یہی ہے چرچا
دُنیا میں جگمگایا بھارت کا اِک ستارا
اِک دھوم مچ رہی ہے خود سو گئے بچارے
دِلّی کے ایک شاعر نوشہ میاں ہمارے

اظہر افسر

کام کرنے والے :

حامد

مُنّی

لڑکا
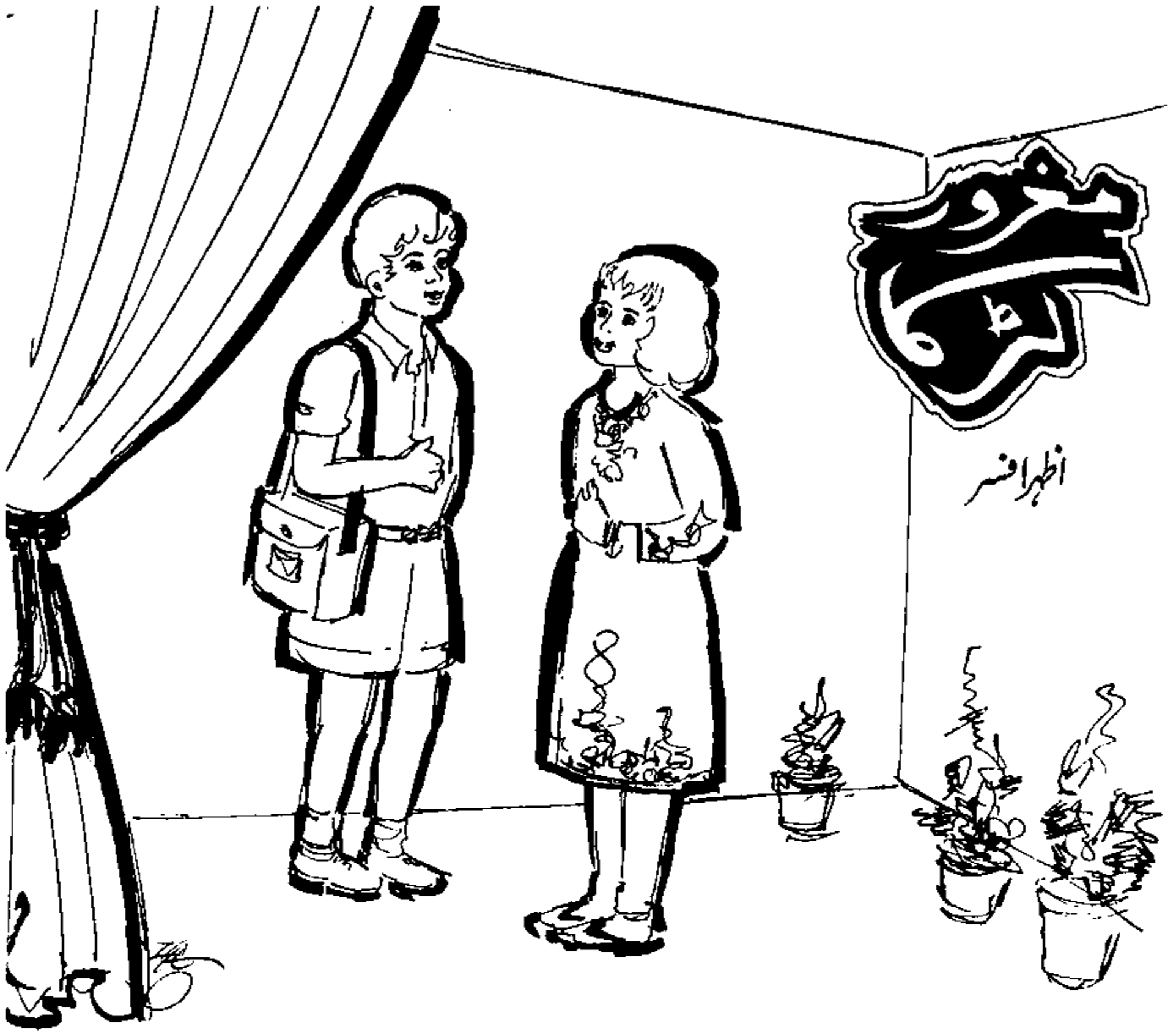
(مکان کا پچھلا حصہ، جس کے صحن میں ایک طرف دیوار ہے۔ دیوار سے ادھر دوسرے مکان کا وسیع صحن ہے جو نظر نہیں آتا۔ پردہ اٹھتا ہے تو دائیں طرف سے مُنّی جس کی عمر دس سال ہے اور جو خوب صورت پھولوں والی قمیض اور تنگ پاجامہ پہنے ہوتے ہے۔ دوڑتی ہوئی آتی ہے اور دیوار کے پاس رک جاتی ہے۔)

مُنّی : (پکارتی ہے) حمو، حمو، ہشت۔

حامد : (باہر ہی سے) ہاں۔

مُنّی : اِدھر آؤ، ایک مزے دار بات سُنو۔

حامد : بولو۔

آپ کے کانوں میں کیا تکلیف ہے؟

مُنّی : یہاں آؤ تو ــــ وہیں سے کھڑے کھڑے بور کر رہے ہو۔ یہاں آؤ۔

(بائیں جانب سے ایک لڑکا خاکی قمیض سفید نیکر پہنے کندھے سے بستہ لٹکائے داخل ہوتا ہے۔ یہ حامد ہے۔)

حامد : کیا ہے؟

مُنّی : پاس والے مکان میں نئے کرایہ دار آگئے۔

حامد : کرائے دار آگئے؟

مُنّی : ہاں۔

حامد : پھر تو بڑا مزہ رہے گا؟ کتنا بڑا باغ ہے، اُن کے ہاں۔

مُنّی : کتنے دنوں سے بند پڑا تھا۔

حامد : اب تو روز جائیں گے۔

مُنّی : خوب کھیلیں گے۔

حامد : جھولا بھی تو ہے وہاں نیم کے پیڑ میں۔

مُنّی : ہاں خوب جھولیں گے۔

حامد : اپنی سائیکل لے جائیں گے۔

مُنّی : خوب کھائیں گے۔

حامد : فٹ بال بھی کھیل سکتے ہیں۔

مُنّی : مزے میں۔

حامد : ٹھہرو ہم میں ابھی آیا۔ ذرا یہ بستہ اندر رکھ آؤں اور مونھہ ہاتھ بھی دھولوں۔

مُنّی : جاؤ جلدی آؤ۔

(حامد بائیں جانب چلا جاتا ہے، مُنّی دیوار کے پاس جاکر اُچک اُچک کر دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ پھر صحن میں ایک پیر سے اُچکنے لگتی ہے۔ بائیں جانب سے حامد، تولیہ سے مونھہ پونچھتا ہوا آتا ہے۔)

حامد : یہ بتاؤ اُن کے ہاں بچے بھی ہیں؟

مُنّی : ہوں گے۔

حامد : ہوں گے سے کیا مطلب؟

مُنّی : ایک لڑکا تو نظر آتا ہے۔

حامد : نظر آتا ہے؟

مُنّی : تمہاری عمر کا ہے ــــ دیکھو۔

(حامد دیوار کے پاس جاکر دیکھتا ہے۔)

حامد : ارے ہاں، ایک لڑکا تو ہے۔ میری ہی عمر کا ہے صحن میں کرسی ہے اور کرسی پر بیٹھا وہ کوئی کتاب دیکھ رہا ہے۔

(تولیہ کندھے پر رکھ لیتا ہے۔)

مُنّی : ہاں بڑی دیر سے پڑھ رہا ہے۔

حامد : کوئی شریف بچہ معلوم ہوتا ہے۔

مُنّی : (ہنستی ہے) بچے بھی شریف ہوتے ہیں۔ کیا ہم تم شریف نہیں ہیں؟

حامد : بالکل نہیں۔ بلکہ ہم تم تو شریفوں کے شریف ہیں۔
منّی : اب کیا ہے میاں، اب تو خوب مزے رہیں گے باغ کے جامن توڑیں گے۔
حامد : بیر بھی۔
منّی : کیریوں کی بہار رہے گی۔ موسم تو آنے دو۔
حامد : خوب کھائیں گے۔
منّی : گلاب کے پھول اور سوزنی کی پھلیاں بھی توڑیں گے۔ لیکن ایک بات ہے۔
حامد : کیا؟
منّی : ہم وہاں جائیں کیسے؟
حامد : گیٹ ہے۔
منّی : تم بھی بعض وقت ایسی بات کرتے ہو کہ بس۔
حامد : اچھا، اچھا، تم کہو۔
منّی : میں کہہ رہی تھی اس لڑکے سے یا اُن لوگوں سے ہم ملیں کیسے؟
حامد : ہاں کیسے؟
منّی : بڑی دیر سے میں یہی سوچ رہی ہوں۔
حامد : (چٹکی بجاتا ہے) ایسا کرتے ہیں، یہاں سے میں اس لڑکے کو پکارتا ہوں۔
منّی : کیا پکاروگے؟
حامد : کچھ بھی، عبدالغنی، محمد غفور، ست نارائن، ہربجن سنگھ، مظہر علی۔
منّی : پھر؟
حامد : پھر کیا، وہ آئے گا، کہے گا میرا نام ہربجن سنگھ یا عبدالغفور نہیں۔ عمر علی خاں ہے۔
منّی : (ہنستی ہے) پھر؟
حامد : پھر کیا، دوستی ہوجائے گی بس ـــــ ہم وہاں

چالیس من کا یہ پتھر میں بڑی آسانی سے دور پھینک سکتا ہوں لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں اسے اٹھا نہیں سکتا

جائیں گے، وہ یہاں آئے گا ـــــ باغ میں دھوم مچائیں گے۔
منّی : مگر یہ اپنے آپ اسے پکار کر یہاں بلانا اور دوستی کرنا مجھے پسند نہیں۔ یہ تو بالکل معیار سے گری ہوئی بات ہے۔
حامد : پھر کیا کریں؟
منّی : ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے، ایسا کرتے ہیں، اندر سے گیند لاؤ۔ تم میری طرف پھینکو اور میں تمہاری طرف۔
حامد : پھر؟
منّی : پھر تم میری طرف پھینکو اور میں تمہاری طرف۔
حامد : ارے بابا میں نے گیند تمہاری طرف پھینک دی تم نے میری طرف ـــــ پھر؟
منّی : پھر یہ کہ میں یا تم یا پھر میں ہی کسی قدر زور سے گیند اُدھر پھینک دوں گی، اور گیند دیوار سے اُچھل کر اُدھر جا گرے گی، اس لڑکے کے قریب۔
حامد : وہ کرسی سے اُٹھے گا
منّی : پہلے کتاب ایک طرف رکھے گا۔

میرے ساتھیوں نے آٹھویں مرتبہ فیل ہونے پر مجھے یہ انعام دیا ہے

حامد : ہاں، کتاب ایک طرف رکھ کر وہ کرسی سے اُٹھے گا اور گیند لے کر ہماری دیوار کی طرف آئے گا۔

مُنّی : مسکرائے گا اور کہے گا۔

حامد : یہ آپ کی گیند — ادھر آگئی تھی — لیجئے۔

مُنّی : ہم کہیں گے شکریہ۔ اور دوستی ہو جائے گی۔

حامد : (تالیاں بجاتا ہے) خوب بھئی خوب۔ منّی خوب سوچا ہے تم نے، ٹھہرو میں گیند لاتا ہوں۔

(حامد گیند لینے بائیں جانب چلا جاتا ہے منّی دیوار کے پاس جاکر اُچک اُچک کر دیکھتی ہے۔ اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر ایک پاؤں سے چاروں طرف اُچکتی ہوئی گاتی ہے۔)

مُنّی : بھائی تو — بھائی تو تم جانے کتی دُور۔ چھ چھینے کا رستہ نکلا۔ ندی آئی بھرپور۔ ندی آئی بھرپور ہاتھی ڈوبیں گے، گھوڑے تیریں گے۔ شفتالو کے جھاڑ کے نیچے حبشی لڑیں گے۔ حبشی میرا بھائی۔ چار کرنے جائی — ارے بھئی آؤ۔

حامد : (باہر سے) آرہا ہوں۔

مُنّی : جنگل جنگل مہندی آگی، بھائی کا پاؤں لال۔ ہار پہن کر باہر نکلی پاؤں پڑا سُنار — بھائی تو۔ بھائی تو ———

حامد : (باہر سے) آرہا ہوں، آرہا ہوں (آجاتا ہے) لو آگیا — یہ لو گیند۔

مُنّی : پھینکو میری طرف۔

(حامد گیند پھینکتا ہے)

حامد : لو ———

مُنّی : (واپس پھینکتی ہے)۔ اور یہ لو

حامد : یہ لو ———

مُنّی : اور یہ لو ———

حامد : ارے ارے یہ تو دیوار سے ادھر باغیچے میں چلی گئی۔

مُنّی : جانے دو، جانے دو (بھاگ کر دیوار کے پاس جاکر دوسری طرف دیکھتی ہے۔)

حامد : کیا ہے؟

مُنّی : گیند لڑھکتی ہوئی لڑکے سے کسی قدر دُور جاکر رُک گئی ہے۔

حامد : اس نے دیکھا؟

مُنّی : ہاں دیکھا تو سہی مگر ایک بار گیند کی طرف دیکھ کر پھر پڑھنے لگا۔

حامد : ہائیں؟

مُنّی : ہاں۔

حامد : اپنی کرسی سے اُٹھا نہیں؟ نکھٹو۔

مُنّی : دوسرا ورق پلٹ کر پڑھنے لگا ہے۔

حامد : اور ہماری گیند وہیں پڑی ہے!

مُنّی : ہاں ٹھہرو، ٹھہرو کوئی آرہا ہے۔

حامد : کون ہے؟
مُنّی : ایک عورت ہے، آرہی ہے۔
حامد : آنے دو۔
مُنّی : پیلی ساری ہے، ہرا بلاؤز ہے، دُبلی، پتلی، بڑی اچھی ہے۔
حامد : اس کی ماں ہوگی۔
مُنّی : وہ جارہی ہے۔
حامد : جارہی ہے؟
مُنّی : ہاں، لڑکے کی طرف۔ اس نے لڑکے کی پیٹھ تھپکی، اور پھر جانے لگی، گیند کی طرف۔
حامد : جانے دو۔
مُنّی : عورت نے گیند اُٹھائی۔ وہ آرہی ہے۔
حامد : آنے دو۔
(گیند دیوار کے اس طرف سے حامد کے سر پہ آگرتی ہے۔)
حامد : مرگیا۔
مُنّی : شکریہ آپ کا۔
حامد : کوئی جواب؟
مُنّی : نہیں کوئی جواب نہیں، وہ عورت بھی چلی گئی۔
حامد : وہ لڑکا۔
مُنّی : وہ اب بھی بیٹھا مزے سے کتاب پڑھ رہا ہے۔
حامد : اکڑو معلوم ہوتا ہے۔
مُنّی : ہاں بے حد مغرور ہے۔
حامد : کلف ہے بالکل کلف۔
مُنّی : کتاب سے کوئی چیز گری۔ اس نے اُٹھا کر پھر سے کتاب میں رکھ لی۔
حامد : مگر اس سے ہماری گیند اُٹھا کر نہ دی گئی۔

میرا سرنج ٹوٹ گیا تھا اس لئے میں جانوروں والا سرنج لے آئی ہوں

مُنّی : ہاں۔
حامد : شاید اُس نے گیند کے لئے ماں کو پُکارا ہوگا۔
مُنّی : ہوسکتا ہے اس کا مطلب ہے وہ بے حد کاہل بھی ہے۔
حامد : یہ ماں باپ ہی اولاد کو خراب کرتے ہیں۔
مُنّی : ہماری اُستانی کہتی ہیں ماں باپ بچّوں کے ساتھ کتنا ہی لاڈ پیار کریں، بچّوں کو چست اور چالاک ہونا چاہیے۔
حامد : اب بھی ایسا ہی بیٹھا ہے نا۔
مُنّی : بالکل یہ مٹی کا مادھو ہے۔ اکڑو ہے۔ کلف ہے حماقت کے پُتلے میں کیا نُور ہے، پرانے طویلے کا لنگور ہے۔
(حامد اور مُنّی زور زور سے گاتے، اور تالیاں بجاتے ہیں۔ حماقت کے پُتلے میں کیا نُور ہے، پُرانے طویلے کا لنگور ہے)
حامد : (پُکارتا ہے۔) کلف۔
مُنّی : اکڑو! کلف!
لڑکے کی آواز: (باہر سے) ممّی دو گھنٹے ہوگئے۔

حامد : دو گھنٹے کیا ہم چار گھنٹے اسی طرح شور کریں گے، کلف! کلف!

مُنّی : ارے حمو

حامد : کیا ہے؟

مُنّی : نواب صاحب اٹھ رہے ہیں۔

حامد : (جاکر دیکھتا ہے) ہاں، ہاں۔

مُنّی : وہ اِدھر ہی آرہا ہے۔ چلتا کیسے ہے۔

حامد : یہ بھی ایک ادا ہے

لڑکے کی آواز : میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔

مُنّی : آؤ، آؤ (ہنستی ہے۔)

لڑکے کی آواز : کدھر سے آؤں؟

حامد : تمہارے گھر کے بائیں جانب جو دروازہ ہے وہ ہمارا ہی گھر ہے۔ آؤ۔

مُنّی : آنے دو خوب گت بنائیں گے۔

(حامد اور مُنّی پھیر گاتے ہیں) حماقت کے پتلے میں کیا نور ہے۔ پُرانے طویلے کا لنگور ہے۔)

حامد : کلف آ رہا ہے۔ آؤ۔ آؤ۔

(ایک لڑکا سفید قمیض اور ڈھیلا پاجامہ پہنے بائیں جانب سے اندر آتا ہے۔)

مُنّی : یہ آپ چلتے کس طرح ہیں؟

حامد : ادا ہے اپنی اپنی، تمہیں کیا۔

(زور سے ہنستا ہے)

لڑکا : بھائی ہنسو نہیں، آج صبح جب ہم لوگ اس گھر میں آئے تھے تو سامان لانے لے جانے میں میرے ہاتھ سے ایک صندوق پھسل گیا اور پیر میں موچ آگئی۔

حامد : موچ آگئی؟

مُنّی : موچ آگئی؟

لڑکا : ہاں، فوراً ممی مجھے گلاب خاں جرّاح کے ہاں لے گئیں اس نے کوئی دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ (دائیں پاؤں کا پائنچہ اٹھا کر دکھاتا ہے۔) یہ دیکھئے۔

مُنّی : ارے ہاں سچ مچ۔

لڑکا : جرّاح نے کہا تھا دو گھنٹے تک میں ایک ہی جگہ بیٹھا رہوں، چلوں پھروں بالکل نہیں۔

حامد : اس لئے تم باغیچہ میں کرسی پر گم صم بیٹھے تھے۔

لڑکا : کیا کروں بیٹھا کتاب دیکھ رہا تھا۔ تم لوگوں کی گیند آئی مگر میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں نے ممی کو بُلا کر تمہاری گیند واپس کرادی، اور تب سے تم لوگ ....

مُنّی : حماقت کا پتلا سمجھ رہے ہیں۔

لڑکا : سب سے زیادہ یہ کہ آکڑو سمجھ رہے ہیں۔ بھئی میں آکڑو بالکل نہیں ہوں۔ چلو تم دونوں ہمارے گھر چلو۔

حامد : بھئی اب تو مجبوری ہے، چلنا ہی پڑے گا۔

مُنّی : تمہارے ابا کیا کرتے ہیں۔

لڑکا : ہیڈ ماسٹر ہیں۔

حامد : ہیڈ ماسٹر ہیں؟ کون سے اسکول کے؟

لڑکا : ابھی تبادلہ ہو کر آتے ہیں۔ کہتے تھے انہیں مڈل اسکول شاہ گنج میں کام کرنا ہوگا۔

حامد : شا۔ شا۔ شا ____

لڑکا : مڈل اسکول شاہ گنج ____ ارے ارے مگر تمہیں کیا ہوگیا ____ یہ تو چکر کھا کر گر گئے۔

مُنّی : یہ اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔

(لڑکا اور مُنّی قہقہے لگاتے ہیں ____)

(پردہ گرتا ہے)

نیا مکتب

کیف احمد صدیقی

ہم چاند نگر پر جاتے ہی کھولیں گے ایک نیا مکتب
تعلیم نہ ہوگی جس میں کبھی سب آزادی سے گھومیں گے
اُستاد پڑھیں گے درجوں میں ہم لوگ خوشی سے گھومیں گے
اسکول نہ جاکر باغوں میں تفریح کریں گے بے مطلب
ہم چاند نگر پر جاتے ہی کھولیں گے ایک نیا مکتب

پڑھنے کے لئے بچّوں کو جہاں مُرغا نہ بنایا جائے گا
چانٹے نہ جمائے جائیں گے ڈنڈوں سے نہ پیٹا جائے گا
اُستاد کے مولا بخش جہاں دِکھلا نہ سکیں گے کچھ کرتب
ہم چاند نگر پر جاتے ہی کھولیں گے ایک نیا مکتب

جو یاد کرے گا خوب سبق تا عمر نہ ہوگا پاس وہی
جو کھیل میں لے گا دِلچسپی پڑھنے میں نہ ہوگا فیل کبھی
دراصل ہمارے مکتب کا ہوگا ہر اک دستور عجب
ہم چاند نگر پر جاتے ہی کھولیں گے ایک نیا مکتب

جس دن بھی کوئی بیمار پڑا اسکول میں ہوگا ہالی ڈے
دو بوند بھی پانی برسا تو ہو جائے گا فوراً رینی ڈے
ہفتے میں کم سے کم چھ دِن اتوار منائیں گے ہم سب
ہم چاند نگر پر جاتے ہی کھولیں گے ایک نیا مکتب

کھیلیں گے کبھی جب ہم کرکٹ تو خوب اُڑائیں گے چھکّے
ہاکی میں دکھائیں گے وہ ہُنر رہ جائیں گے سب ہکّے بکّے
ہر ٹیم سے میچیں جیتے گا ہم لوگوں کا فٹ بال کلب
ہم چاند نگر پر جاتے ہی کھولیں گے ایک نیا مکتب

آپریشن تو ختم کر لو
مجرم
بعد میں پڑھ لینا

JAGDISH PARKAS
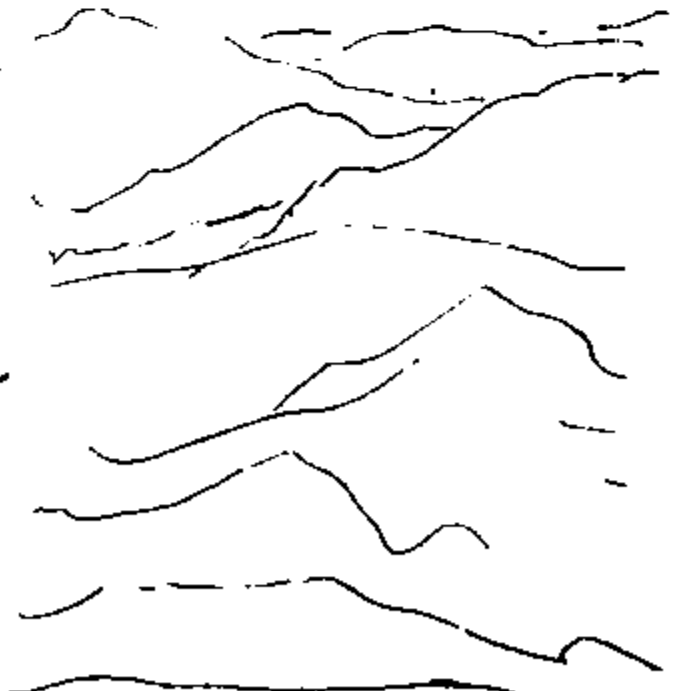
مجرم بے ہی اتنا دل چسپ کہ ایک بار شروع کر دینے کے بعد آپ اسے پورا پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے اور اب تو یہ پہلے سے بھی زیادہ دل چسپ اور خوب صورت ہو گیا ہے۔ "شبستاں اُردو ڈائجسٹ" کی طرح رنگین چھاپا جاتا ہے۔ مجرم ہر ماہ ایک مکمل جاسوسی ناول کے ساتھ ساتھ جرم و سزا کی کہانیاں بھی شائع کرتا ہے، جو کسی دوسرے رسالہ میں نہیں ہوتیں۔ آج ہی اپنے ایجنٹ سے یا ریلوے بک اسٹال سے حاصل کیجئے۔ ایک کاپی کی قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے ہے اور سال بھر کی قیمت پندرہ روپے ہے جس میں سال نامہ مفت دیا جاتا ہے۔

چراغوں کی بستی

ابرار محسن

سچائی کا سورج طلوع ہو کر اپنی بے پناہ روشنی سے اندھیروں پر یلغار کر رہا تھا۔ اجالوں کے سیلاب اُمنڈے پڑ رہے تھے۔ زمانہ کروٹ بدل رہا تھا۔ آسمان پر دمکنے والے لاکھوں برس پرانے ستارے انسان کی تاریخ کا یہ انوکھا موڑ دیکھ کر حیران تھے۔ ان ہی ستاروں نے اپنی لاکھوں آنکھوں سے بار ہا قوموں کو اُبھرتے دیکھا تھا۔ مگر روم، عراق، بابل اور مصر جیسی "مہذب" سرزمینوں پر بھی انسانیت ہمیشہ سسکتی رہی تھی۔ انسان ہر دور میں انسان پر حکومت کرتا نظر آیا تھا، انسان انسان کو بازاروں میں فروخت کرتا رہا تھا۔ ستارے حیران تھے۔ ان کی نگاہیں اُس انسان کو تلاش کر رہی تھیں جس کا مقام خود اُن سے بھی زیادہ بلند تھا۔ ہزاروں برس گزر گئے۔ آخر ستاروں نے اس تاریک زمین پر ایک چراغ جلتا ہوا دیکھا۔ آندھیاں اُسے بجھانے کے لئے سر مارتی رہیں، طوفان اُٹھتے رہے، مگر چراغ جلتا رہا۔ اُس ایک چراغ سے دوسرے چراغ جلنے لگے، سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں۔

اور اس زمین پر ہر طرف چراغ ہی چراغ جل اُٹھے، جو فلک کے ستاروں سے زیادہ روشن تھے۔ اب انسان پر انسان کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور انسان ایک دوسرے سے گلے مل رہا تھا، جیسے تمام فرق مٹ گئے ہوں، کوئی چھوٹا بڑا نہ ہو، بلکہ سب برابر ہوں۔

پھر تاریخ خود حیرت سے چیخ اُٹھی جب چراغوں کی بستی میں فوج کا سردار ایک غلام کے لڑکے کو بنایا گیا۔ تاریخ اس انوکھی بات کی عادی نہ تھی۔ "مہذب" دور میں بھی غلام کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ اُسے جانوروں سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا۔ مگر چراغوں کی بستی میں یہ عجیب بات ہو رہی تھی!

"ایک غلام اور سردار" لوگ سوچ رہے تھے۔ "یہ کس طرح ممکن ہے! غلام کو اتنا بلند مقام!"

وہ حکمران جس نے غلام کے لڑکے کو سرداری کا اعلان کیا تھا لوگوں کی یہ بڑبڑاہٹ سُن رہا تھا۔ اُسے وہ

دن صاف صاف یاد تھا جب اُس لڑکے کے باپ کو غلام کی طرح فروخت کر دیا گیا تھا اور وہ اُس انسان کے پاس پہنچ گیا تھا جس سے بڑا انسان اس سرزمین پر آج تک پیدا نہیں ہوا۔

غلام کے والدین اپنے عزیز بیٹے کی آزادی کے لئے اُجالوں کے اس علم بردار کے پاس آئے۔

"ہمارے بیٹے کو آزاد کر دو۔" انھوں نے کہا۔

غلام کے والدین ہکّا بکّا رہ گئے جب انھوں نے دیکھا کہ دنیا کے عظیم ترین انسان نے مسکرا کر کہا۔ "اگر تمہارا لڑکا چاہے تو وہ آزاد ہے۔"

کون آزادی نہ چاہے گا؟ کتنی عجیب بات تھی! غلام رہنا کون پسند کرے گا؟ مگر غریب والدین کو کیا معلوم کہ چراغوں کی بستی کی یہ غلامی "مہذّب" سرزمین کی غلامی سے مختلف تھی۔ یہ وہ بستی تھی جہاں غلام سردار بنائے جاتے تھے۔

غلام حاضر ہوا۔ اس کے ایک طرف اس کے پیارے والدین کھڑے تھے اور دوسری طرف اُجالوں کا علم بردار، اندھیروں کا سب سے بڑا دشمن، خدا کا آخری رسول کھڑا تھا۔

"میں آزاد ہونا نہیں چاہتا۔" غلام نے کہا۔ اور اس کے والدین حیران رہ گئے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے وہ آزادی نہیں چاہئے جس میں اندھیرے ہوں، بلکہ وہ غلامی زیادہ عزیز ہے جو غلامی کا مذاق اُڑاتی ہے، جو ذرّے کو آفتاب بنا دیتی ہے، جس کی آن بان سے ستارے بھی شرماتے ہیں۔ یہ وہ غلامی ہے جس کی خاطر بادشاہتیں ٹھکرائی جاتی ہیں۔ ہاں میں غلام ہوں ایک ایسا غلام جسے اُس کا آقا اولاد سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔ چراغوں کی اس بستی کا یہی دستور ہے۔ جاؤ، میں اُجالوں کو پہچان چکا ہوں اور اب تمہاری تاریک وادیوں میں نہیں جاؤں گا۔ تم میرے والدین ہو، مگر میرا آقا میرے لئے تم سے بھی بڑھ کر ہے۔"

اور اب اِسی غلام کے لڑکے کو لشکر کا سردار بنایا گیا۔

تاریخ حیران تھی۔

لشکر روانہ ہو چکا تھا۔ سردار انوکھی شان سے چلا جا رہا تھا۔ زمین گھوڑے کی ٹاپوں تلے لرز رہی تھی۔ زنجیروں میں جکڑا رہنے والا انسان ہزاروں برس کے "مہذب" دور کے بعد اتنا بلند مقام حاصل کر چکا تھا۔ چراغوں کی بستی کا حکمران خلیفۂ وقت سردار کو ہدایات دینے کے لئے پیدل دوڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور لباس سب گرد آلود تھے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" سردار نے کانپ کر کہا۔ "آپ پیدل۔ اور میں سوار!"

"پرواہ نہ کرو۔" حکمراں نے کہا۔ "ابوبکر حکمراں ضرور ہے مگر وہ تمہارے مقام کو پہچانتا ہے۔ اے اُسامہ، دنیا کا سب سے بڑا انسان تمہیں بہت چاہتا تھا۔ پھر میں کیوں نہ تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاؤں۔ اُسامہ! اُجالوں کے علم بردار نے ہمیں ایک راستہ دکھایا ہے، سچائی اور حقیقت کا۔ ہم سب اس راہ کے راہی ہیں۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، شاہ و فقیر سب کے سب۔ ہم میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ ہاں جو لوگ زیادہ نیک ہیں، وہ زیادہ بڑے ہیں۔"

ستاروں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ انھوں نے کبھی ایک حکمراں کو غلام کے بیٹے کے ساتھ اس طرح پیدل بھاگتے نہیں دیکھا تھا۔ ابھی تک حکمراں سُرخ محلوں میں رہتے تھے اور ہزاروں غلام اُن کی خدمت کرتے تھے۔ مگر یہ حکمراں پیدل دوڑ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ، اُس کا لباس، اُس کا جسم، سب دھول میں اَٹ رہے تھے۔ ستاروں نے دیکھا اِسی دھول کے ذرّات آسمان کی طرف پرواز کرنے لگے۔ اوپر، بہت اوپر۔ ستاروں سے بھی بہت بلند۔ اِن کی چمک کے آگے ستارے ماند پڑ گئے ●●

لاری کی مصیبت

یکتا امروہوی

ایک موٹر سائیکل روتی ہوئی — آئی اپنی جان کو کھوتی ہوئی
آ کے بولی ایک موٹر کار سے! — آ رہی ہوں میں ابھی بازار سے
لائی ہوں آپا یہ اک اخبار میں — اس میں خبریں تو بہت سی آج ہیں
لیکن اس میں اک خبر ایسی ہے آج! — بڑھ گیا جس سے مرا تو اختلاج
بڑھ گئی اُف دل کی دھڑکن اور بھی — اس طرف تم نے کیا کچھ غور بھی
ہو گئے ہیں گُم مرے ہوش و حواس — کاش جا پہنچوں ابھی امّی کے پاس
خود بخود اُمڈا چلا آتا ہے دل — کیا کہوں بیٹھا ہی سا جاتا ہے دل
آنکھ کے آنسو مرے تھمتے نہیں — ہائے وہ میری نہ ہوں امّی کہیں
دیکھئے تو پڑھ کے جلدی سے خبر — ڈالئے اخبار پر جلدی نظر
کار یہ گھبرا کے بولی خیر ہے — مجھ سے یہ کیا کہہ گئیں تم بیٹے بیٹے
عقل میں میری تو کچھ آتا نہیں — مجھ سے تو کچھ بھی پڑھا جاتا نہیں
تم ہی بتلاؤ لکھا ہے اس میں کیا — کیا تعلق اس سے امّی کا بھلا
بولی موٹر سائیکل آپا مری! — سُرخیاں تو دیکھئے اخبار کی
اچھا یہ خبروں کا کالم دیکھئے — کیوں نہ ہو مجھ کو بھلا غم دیکھئے
کار نے اخبار ہاتھوں میں لیا — اور پھر نزدیک آنکھوں کے کیا
دے کے پہیّے کو سہارا ہاتھ سے — جلد کالم کو اُبھارا ہاتھ سے
ایک سُرخی تھی یہ اُس اخبار کی — "راستے میں ایک لاری لُٹ گئی"
درج تھی سُرخی کے نیچے یہ خبر — کر رہی تھی جب کہ یہ لاری سفر
شمل نگر اور نور گڑھ کے درمیاں — اُس پہ ڈاکو آ پڑے کچھ ناگہاں
جس قدر ڈاکو تھے سب خونخوار تھے — اپنی بندوقیں لئے تیار تھے!
جب نہ روکے سے کبھی یہ لاری رُکی — گولیوں کی اس پہ اک بوچھار کی
جس سے چھلنی ہو گئی لاری تمام — آ گیا فوراً ڈرائیور اُس کا کام
جب لگیں پہیوں پہ اُسکے گولیاں — پھٹ گئے ٹائر رُکی لاری وہاں
رُک گئی لاری تو اُس کو لُوٹ کر — چل دیئے ڈاکو نہیں جن کی خبر
اِن پولیس موقع پہ جا پہنچی ہے اب — ڈاکوؤں کو دیکھئے پکڑے وہ کب!
اس خبر کو پڑھ کے موٹر کار بھی — ہکا بکا رہ گئی گھبرا گئی
اور کہا دل نے کہ یہ لاری ضرور! — تھیں تو امّی ہی ہماری بے قصور
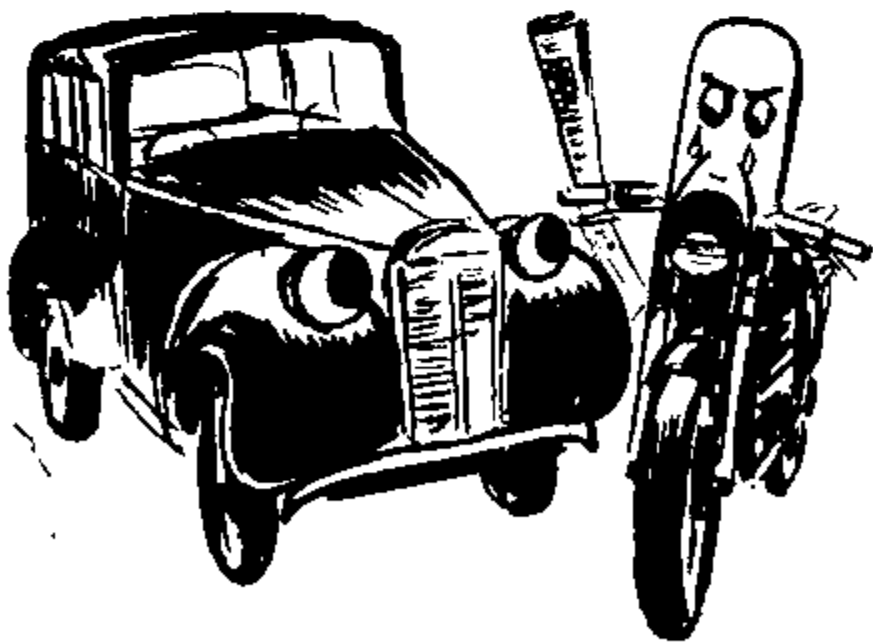
اس طرف کو ان ہی کا نمبر تھا آج
یا الٰہی ان کا اچھا ہو مزاج

بولی موٹر سائیکل پڑھ دی خبر؟
کار آیا کچھ تو بولو ہو کدھر

ہوگئیں چپ پڑھ کے کیوں اخبار تم
دیکھتی ہو غم کے کیا آثار تم

جلد بولو اُٹھو گھٹا جاتا ہے دم
ہو گئے کیا آج سے بن ماں کے ہم

کار نے دیکھا کہ موٹر سائیکل
ہاتھ سے تھامے ہوئے ہے اپنا دل

کچھ تسلی گر نہ دی میں نے اُسے
کیا عجب غش کھا کے فوراً گر پڑے

میں بڑی ہوں یہ بہت چھوٹی سی ہے
دل کی بھی کم زور ہے یہ بھی ہے طے!

سوچ کر یہ کار نے اُس سے کہا
تھیں وہ امّی ہی یقیں اس کا ہے کیا؟

شک نہیں آج اُن کا نمبر تھا مگر
ہوگیا ہو ملتوی اُن کا سفر

اور کوئی اُن کے بدلے ہوگئی!
دیکھتے ہیں چل کے اڈّے پر ابھی

پھٹ پھٹی خاتون موٹر سائیکل
کار بے بی آسٹن رنجیدہ دل

پھڑپھڑاتی پھٹ پھٹاتی چل پڑیں
دیکھا اڈّے پر تو امّی جاں نہ تھیں

رہ گیا دھک سے ہی اُن دونوں کا دل
چیخ کر رولی جو موٹر سائیکل!

آدمی فوراً بہت سے آگئے!
ڈر گئے کچھ اور کچھ گھبرا گئے!

دیکھا سب نے کار بھی اک غم میں ہے
غم میں کیسی اک عجب عالم میں ہے

پھٹ پھٹی خاتون نے رو کر کہا!
ہائے ہائے ہم تمھیں بتلائیں کیا!

تم یہ بتلاؤ کہ لاری کون سی!
نور گڑھ ہے آج اڈّے سے گئی

کچھ بتاؤ حشر کیا اُس کا ہوا!
اس کی کچھ بھی خیریت آئی ہے کیا!

آدمی بولے کہ سولہ سو پچاس
اس کا نمبر تھا کہ جو ڈھکّے کے پاس

لٹ گئی بے کار ہو کر رہ گئی
نور گڑھ تک وہ نہ مطلق جا سکی!

آدمی جتنے بھی اس اڈّے کے تھے
سن کے فوراً ہی وہ موقع پر گئے

اپنی اماں کا بھی جب نمبر سنا
اور سنا لٹنے کا اُس کے ماجرا

کار و موٹر سائیکل اُف چیخ اُٹھیں
بیٹی روتی ہی ڈھکّے کو چلیں

پہنچیں ڈھکّے کھو کے سب تن من کا ہوش
دیکھنے کا تھا فقط امّی کے جوش

پہنچیں جب ڈھکّے تو کیا دیکھا وہاں
کہہ رہے ہیں سب نہیں لاری میں جاں

گولیوں سے اس کی بوڑھی چھن گئی
بلکہ اس کی جان پر ہی بن گئی۔

اس کے پُرزے ہو گئے بیکار سب — اس کے ٹائر تک نہ کام آئینگے اب
ہوگئیں ایک اس کی ٹوٹی پسلیاں — جسم ہے بس رُوح اب اس میں کہاں
ایک بولا نبض اس کی دیکھ کر — کر گئی لاری یہ دنیا سے سفر!
دے دیا اس مستری نے جب جواب — ہوگئی دونوں کی بس حالت خراب
کار روئی خوب سینہ پیٹ کر — اور موٹر سائیکل زانو دستر؟
دونوں مِل کے آہیں یوں بھر بھر کے رونیں — بین دونوں خوب یوں کرکے روئیں
آہ! امّی اب تمھیں ڈھونڈیں کہاں — آپ کی ہم دونوں آخر بیٹیاں
گولیاں کس کس جگہ آخر لگیں — کاش وہ ڈاکو بھی مرجائیں کہیں
کیسے ڈاکو لالچی تھے ہائے ہائے — کیسے ظالم تھے شقی تھے ہائے ہائے
آہ تم - بن ماں کا ہم کو کر گئیں — آہ! ہم زندہ ہیں اور تم مر گئیں
آج سے امّی کہیں کے ہم کیسے — کیوں نہ بتلاؤ ہمارا دل پھٹے
یہ ابھی رو ہی رہی تھیں کرکے بَین — سُن رہے تھے آ کے سب یہ شور وشین
آگئے دو بیل بلوائے ہوئے — رسیاں بندھ کر جو لاری میں جُتے
ہائے بیلوں نے گھسیٹا اس طرح — بَل وہ اپنا کھینچتے تھے جس طرح
بولی بیلوں سے یہ موٹر سائیکل — بھائی بیلو! ہو بہت تم سخت دل
کھینچتے ہو اس طرح مُردے کو تم — بیل بولے اس کی کیا بیٹی ہو تم؟
رو کے موٹر سائیکل بولی کہ ہاں — کار آپا اور یہ میری تھیں ماں
سُن کے یہ غم کھا کے بیلوں نے کہا — اب سوائے صبر کے چارہ ہے کیا
دونوں بہنیں صبر سے اب کام لو — رو گی کب تک بھلا اب چُپ رہو
آگیا لو شہر بھی وہ آگیا! — ہم تو ہونے کو ہیں اب تم سے جُدا
آگیا نزدیک ہی وہ ورکشاپ — وہ دُھواں سکا ہے وہ آگ ہے بھاپ

اب یہاں پہنچا کے اس کو جاؤ تم
جا کے اس کی فاتحہ دِلواؤ تم
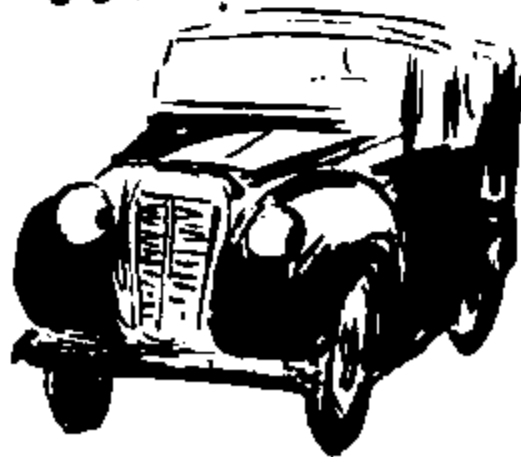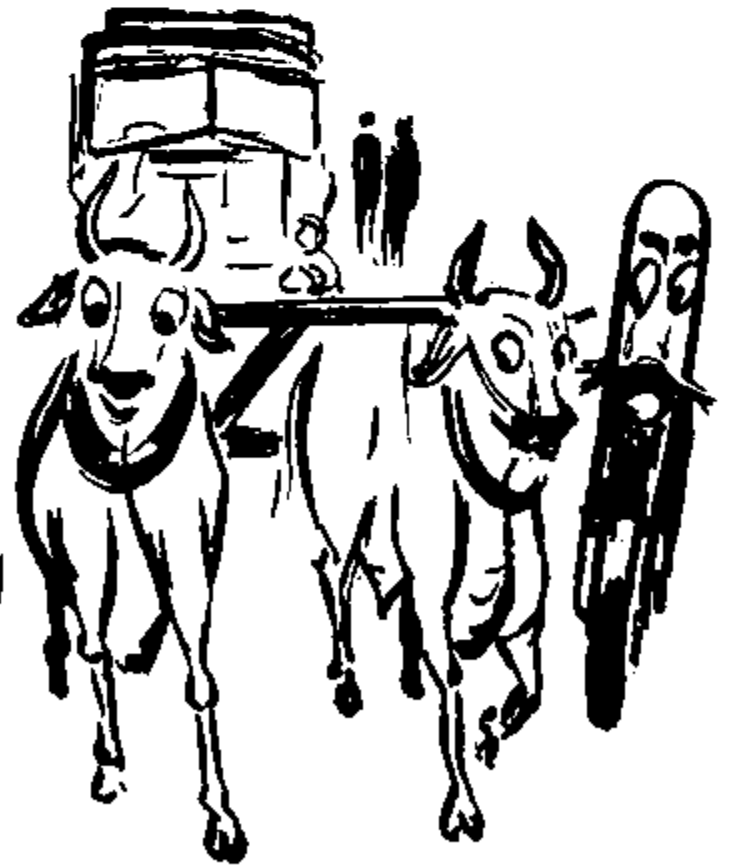
شمع کشیدہ کاری

سالنامہ
نئی دہلی

م، ندیم

شبراتی کی بارات

شبراتی کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کی بارات میں چلنے کا وعدہ میں کرچکا تھا۔ لیکن پہلے ذرا آپ کا تعارف اپنے بچپن کے دوست شبراتی سے کرادوں۔

شبراتی دُھوبی ہے، جی ہاں! دُھوبی۔ میں اور وہ پرانے دوست ہیں۔ ساتھ ساتھ کھیلے کودے ہیں، ساتھ ساتھ شرارتیں کی ہیں۔ لڑائی جھگڑا بھی کیا ہے اور سچ سچ ہی بتادوں وہ بدن میں مجھ سے تگڑا تھا۔ اس لئے ہمیشہ وہی جیتا اور میں ہارا۔

میں جب ذرا بڑا ہوا تو میرے ابا جان نے مجھے مکتب میں بٹھادیا اور شبراتی کے باپ نے اُسے بجائے مکتب میں

ممی سے کہہ دو۔ میں نہائے بغیر سکول نہیں جا سکتا اور ٹب کا نل خراب ہو گیا ہے۔

بھیجنے کے گھاٹ پر کپڑے دھونے بھیج دیا۔ وہ وہاں کپڑوں کو ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر دھوتا تھا اور ادھر مکتب میں جہاں میرا دل پڑھنے لکھنے میں بالکل نہیں لگتا تھا، میرے استاد مجھے ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر میرا دل ودماغ کتابوں میں زبردستی کھپانا چاہتے تھے۔ میں شبراتی کی قسمت پر رشک کرتا تھا کہ وہ مکتب کی قید سے آزاد ہے اور استادوں کے ڈنڈوں سے بے نیاز ہے۔

مگر شبراتی کا دل گھاٹ پر بالکل نہیں لگتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے ابا بھی اس کو مکتب میں بھیج دیں۔ اس نے کئی بار ضد بھی کی تھی کہ وہ گھاٹ پر کپڑے دھونے نہیں جائے گا بلکہ مکتب میں جائے گا۔ اس پر اس کے ابا نے اسے سمجھایا کہ وہ دھوبی ہے، اس کا کام یہ ہے کہ وہ بابو لوگوں کے کپڑے صاف صاف دھوئے اور ان کو اور ان کے سارے خاندان کو صاف ستھرا رکھے۔ اگر اس کی برادری کے سب لوگ اپنے بچوں کو گھاٹ پر بھیجنے کی بجائے مکتب بھیج دیں تو محلے اور شہر والے کدھر جائیں گے؟ ان کے کپڑے کون دھوئے گا؟ اور پھر دھوبی برادری کا پیٹ کیسے بھرے گا۔

یوں شبراتی کی زندگی کے وہ معصوم اور سنہرے دن جو کسی مکتب یا مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے میں گزرنے چاہئے تھے۔ وہ گھاٹ، میلے کپڑوں اور گدھوں کے درمیان سماج کو صاف ستھرا بنائے رکھنے میں گزرنے لگے۔

مجھے جب بھی مکتب سے چھٹی ملتی اور شبراتی کو گھاٹ سے، تو ہم دونوں کھیلنے نکل جاتے اور شرارتیں کرتے اس طرح بہت سارے دن بیت گئے میں مکتب اور مکتب سے اسکول اور اسکول سے شہر کے کالج میں پڑھنے چلا گیا۔ اب شبراتی سے صرف ان دنوں میں ملاقاتیں ہوتیں جب میں کالج بند ہونے پر اپنے گاؤں کو آتا۔ شبراتی میرے گھر کے کپڑے دھوتا اور مجھ پر تو وہ بہت ہی مہربان تھا میرے کپڑے بہت اُجلے دھوتا اور بے شکن استری کرتا تھا کیوں نہ مہربان ہوتا، آخر میرا دوست جو تھا۔ میں بھی جب شہر سے آتا تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتا۔ ہم دونوں شام کو ندی کے کنارے، امرودوں اور آموں کے باغوں میں جاتے اور کبھی کبھی چھوٹا موٹا شکار بھی کر لاتے۔

دن اسی طرح بیت گئے اور میاں شبراتی اور ہم بچپن کی سرحدوں کو پار کرکے جوانی کی منزلوں میں پہنچ گئے۔

شبراتی کے باپ سے اب کام نہیں ہوتا تھا، وہ بوڑھا جو ہوگیا تھا شبراتی نے اب دو نوکر رکھ لئے تھے اور شہر میں دُکان بھی لے لی تھی۔ اب شبراتی کے نوکر کپڑے دھوتے تھے۔ شبراتی صرف دُکان پر بیٹھتا تھا۔ اس کے پاس کافی رقم جمع ہوگئی تھی۔ ایک تو مہنگائی کی وجہ سے کپڑوں کی دُھلائی بھی بڑھ گئی تھی۔ دوسرے شبراتی بہت اُجلے کپڑے دھونے میں ماہر تھا اور پھر آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ چھوٹا بڑا، امیر، غریب، بچہ، بوڑھا، سب ہی صاف

ستھرے کپڑے پہنتے ہیں، بغیر دھوبی کے گزارہ مشکل کیا بلکہ ناممکن ہے۔ ہم سب کسی نہ کسی شبراتی کا احسان اُٹھاتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو ہم صاف ستھرے اور شریف انسان کیسے کہلاتے۔

ایک دن شبراتی نے مجھے خوش خبری سنائی "بھیا فضلو رو وہ مجھے اب بھی بچپن کے نام ہی سے پکارتا ہے میری شادی ۲۸ر دسمبر کو ہونے والی ہے۔ بارات میں تم ضرور چلوگے۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ تمھیں چھٹی ملے یا نہ ملے۔ بھلا شادی بیاہ کوئی روز روز تو ہوتے نہیں۔ پڑھائی تو روز ہی ہوتی ہے"۔ میں اس کی بات پر ہنس دیا۔ اور میں نے پکا وعدہ کرلیا کہ بارات میں ضرور چلوں گا.... ایک تو وہ میرا بچپن کا یار اگر نہ جاؤں تو بُرا مان جاتا دوسرے میں نے سوچا کہ بارات ایک دیہات میں جا رہی ہے۔ دیہاتی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اور دیہات میں شادی بیاہ کا منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ بڑی دھوم دھام ہوتی ہے۔

شادی کی تاریخ آگئی۔ بارات چلنے کو تیار ہوئی بارات کیا تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک بڑا سا قافلہ ہے جو کسی یاترا کو نکلا ہے۔ چھ سو باراتی تھے۔ بس، سائیکلیں، گھوڑے گدھے اور یکّے سب ہی قسم کی سواری کا انتظام تھا۔ اور کھانے پینے کے سامان کا بھی معقول ذخیرہ ساتھ تھا۔

میں نے شبراتی سے کہا "یار اس مہنگائی کے زمانے میں چھ سو باراتی لے جانے کی کیا تُک ہے؟ یہ تو سراسر فضول خرچی ہے"۔

شبراتی بولا "ارے بھائی فضلو، اس میں میرا ذرا بھی قصور نہیں ہے۔ ہوا یہ کہ لڑکی کا باپ برادری کا چودھری

میں نے ایک سال تک اس لئے فیس نہیں دی تھی کہ میرے لڑکے کو ہر مضمون میں زیرو ملے۔

ہے۔ اُس نے کہا کہ میرے لے دے کے ایک ہی لڑکی ہے ایسی بارات لائیو کہ لوگ دیکھ کر کہیں کہ چودھری نے خوب دھوم دھام سے بیاہ کیا۔ وہ تو بڑی مشکل سے چھ سو پر راضی ہوا ایک ہزار کے لئے کہہ رہا تھا اور اُس نے یہ بھی شرط رکھی کہ بدایوں کی آتش بازی (آتش بازی) متھرا کا باجا اور بنارس کی نوٹنکی بھی ساتھ لائیو۔ سو وہ بھی لے جا رہا ہوں۔

جیسے تیسے کرکے پہلے بس پہنچی، پھر یکّے گھوڑے والے اور پیچھے پیچھے گدھے والے اور سائیکل سوار۔

کرن پور گاؤں کے قریب ندی کے اس کنارے سارے باراتی اُتر پڑے۔ شام ہونے کو تھی۔ راشن تقسیم ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شبراتی کے باپ نے سارے شہر کے حلوائیوں کے لڈّو خرید لئے تھے۔ ہر ایک کے حصّہ میں ایک ایک سیر آئے۔ رنگ برنگ کے لباسوں والا یہ مجمع کسی چھوٹے موٹے دیہاتی میلے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بچّے اور عورتیں بہت مگن تھے۔ شبراتی کے دوست گا بجا رہے تھے۔ ذرا ہی دیر کے بعد بارات کے استقبال کو لوگ آپہنچے۔ بارات روانہ ہوئی سارا کرن پور بارات کے استقبال کو یا دیکھنے کو اُمڈ پڑا۔ آتشبازی اور نوٹنکی نے دُور دُور کے دیہاتوں میں اس شادی کی پبلسٹی کر دی تھی۔ ایک بڑے سے پنڈال

میں باراتیوں نے قیام کیا۔ لوگ پہلے بیٹھے پھر لیٹ گئے۔ بچے دھماچوکڑی مچانے لگے۔ باجوں کا شور۔ فلمی گانوں کی تیز آواز۔ سارا گاؤں گونج اٹھا۔ رات ہوگئی۔ بھوک کے مارے میری آنتیں قل ہواللہ پڑھنے لگیں۔ میں نے شام کے راشن میں صرف تین چار لڈو ہی کھائے تھے اُن سے کیا بنتا۔ انتظار کرتے کرتے رات کے بارہ بج گئے۔

خدا خدا کر کے قاضی صاحب تشریف لائے۔ کچھ تسلی ہوئی کہ اب نکاح ہوا اور کھانا کھلایا جائے گا۔ مگر پہلی سے معلوم ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ کچھ مہر کے معاملہ پر جھگڑا ہے۔ پہلے تو دونوں فریقوں میں صرف زبانی ہی تیز تیز تازی ہوئی، پھر ہاتھ پاؤں سے اور جلد ہی پنڈال میدانِ جنگ بن گیا۔ میں حیران و پریشان کھڑا تھا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ پگڑیاں اچھل رہی تھیں۔ ڈنڈے برس رہے تھے۔ بچے چیخ رہے تھے۔ ایک ڈنڈا میری پیٹھ پر بھی آن لگا۔ اور کسی نے کہا "گھیر لو یہ دولہا کا بھیا ہے"۔

میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ میرے جوتے وہیں رہ گئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ میرے پیچھے تین چار آدمی تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے یا لاٹھیاں ہوں گی۔ مجھے خوف بھگائے لئے جا رہا تھا۔ چاندنی میں ہر چیز صاف صاف نظر آ رہی تھی میرے سامنے ایک تالاب تھا اور اِدھر اُدھر مکانات اور پیچھے وہ ڈنڈے والے۔ اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ کسی کے گھر میں گھسنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ناچار اسی گندے تالاب میں کود پڑا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوسرے کنارے جا ہی لگا۔ پھر میں نے دم نہ لیا اور بھاگتا بھاگتا اس روشنی کی طرف لپکا جو قریب ہی پر مجھے نظر آ رہی تھی۔ سردی خوف اور بھوک نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ میرا خون جم سا رہا تھا۔ وہ گنے کا کھیت تھا وہاں گڑ پک رہا تھا۔ لوگوں نے میرا حلیہ دیکھا تو پہلے تو مجھے چور سمجھا مگر جب میں نے اپنی بپتا ان کو سنائی تو وہ ہنسے بھی اور مجھ پر ترس بھی کھایا انھوں نے مجھے کچھ کھانے کو دیا اور میرے کپڑے سکھائے۔ جھونپڑی میں مجھے سونے کو جگہ دی۔

صبح کے وقت کچھ لوگ میری تلاش میں اُدھر آ نکلے میرا دَم سوکھ گیا کہ بلا ٹلی نہیں۔ مگر دیکھا تو شبراتی اور دوسرے لوگ تھے۔ دُلہن کا باپ بھی اُن میں تھا۔

شبراتی بولا "ارے فضلو بھائی اور سب لوگ تو مل گئے، تمھاری ساری رات تلاش رہی۔ خدا کا شکر ہے تم خیریت سے مل گئے؛ ورنہ میری بڑی بدنامی ہوتی، چلو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ تم بھوکے ہو گے"۔

میں نے غصّے سے کہا "یار مجھے تو معاف کر دے میں باز آیا اس دعوت اور بارات سے۔ جان بچی لاکھوں پائے"۔

شبراتی ہنسا "ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم نے نہ بیاہ کیا نہ باراتیں دیکھیں۔ ایسا تو بیاہ باراتوں میں ہوتا ہی رہتا ہے"۔

دُلہن کے باپ نے بھی بہت اصرار کیا۔ مجھے مجبوراً جانا پڑا۔

اب جب بھی مجھے کوئی بارات میں چلنے کی دعوت دیتا ہے تو مجھے شبراتی کی شادی یاد آجاتی ہے۔ میں کسی کی بارات میں جانے سے ڈرتا ہوں اور اگر مجبوراً جانا ہی پڑتا ہے تو اپنے لئے ایسی جگہ چنتا ہوں جہاں سے خطرے کے وقت آسانی کے ساتھ فرار ہو سکوں۔ ●●

ننھے بچّے کا عزم

نریش کمار شاد

رشتۂ ماسوا توڑنے کے لئے
پنجۂ جبر کو موڑنے کے لئے
سرِ جفا کار کا پھوڑنے کے لئے
میرے ہاتھوں کو کر زورِ طاقت عطا
اے خدا! اے خدا! میرے پیارے خدا

جنگ کا ذکر ہی ختم کر دوں گا میں
امن ہی امن عالم میں بھر دوں گا میں
ظلمتوں کو نویدِ سحر دوں گا میں
جو ذرا سا بھی تو نے سہارا دیا
اے خدا! اے خدا! میرے پیارے خدا

جس کی کرنوں سے گُل مُسکرانے لگیں
جس سے کُوئے و مکاں جگمگانے لگیں
لوگ درسِ مساوات پانے لگیں
ایسا خورشید بن کر اُبھرنا سکھا
اے خدا! اے خدا! میرے پیارے خدا

ذرا ٹھہریئے
SHAMA LABORATORIES
کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں
لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔
ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسیلیکس" ایک بار۔ صرف ایک بار
استعمال کر کے دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے
کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض
ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلز) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا
کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب
کر بیٹھتے ہیں اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔
قیمت: تین روپے
شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز۔ لال کنواں دہلی

اظہار اثر

اُلٹی خاک

چچا ریاض اپنی دو چیزوں کے لئے سارے شہر میں مشہور تھے ۔ ــــ ایک اپنی کنجوسی کے لئے اور دوسرے اپنی کباڑ خانے کی دوکان کے لئے۔
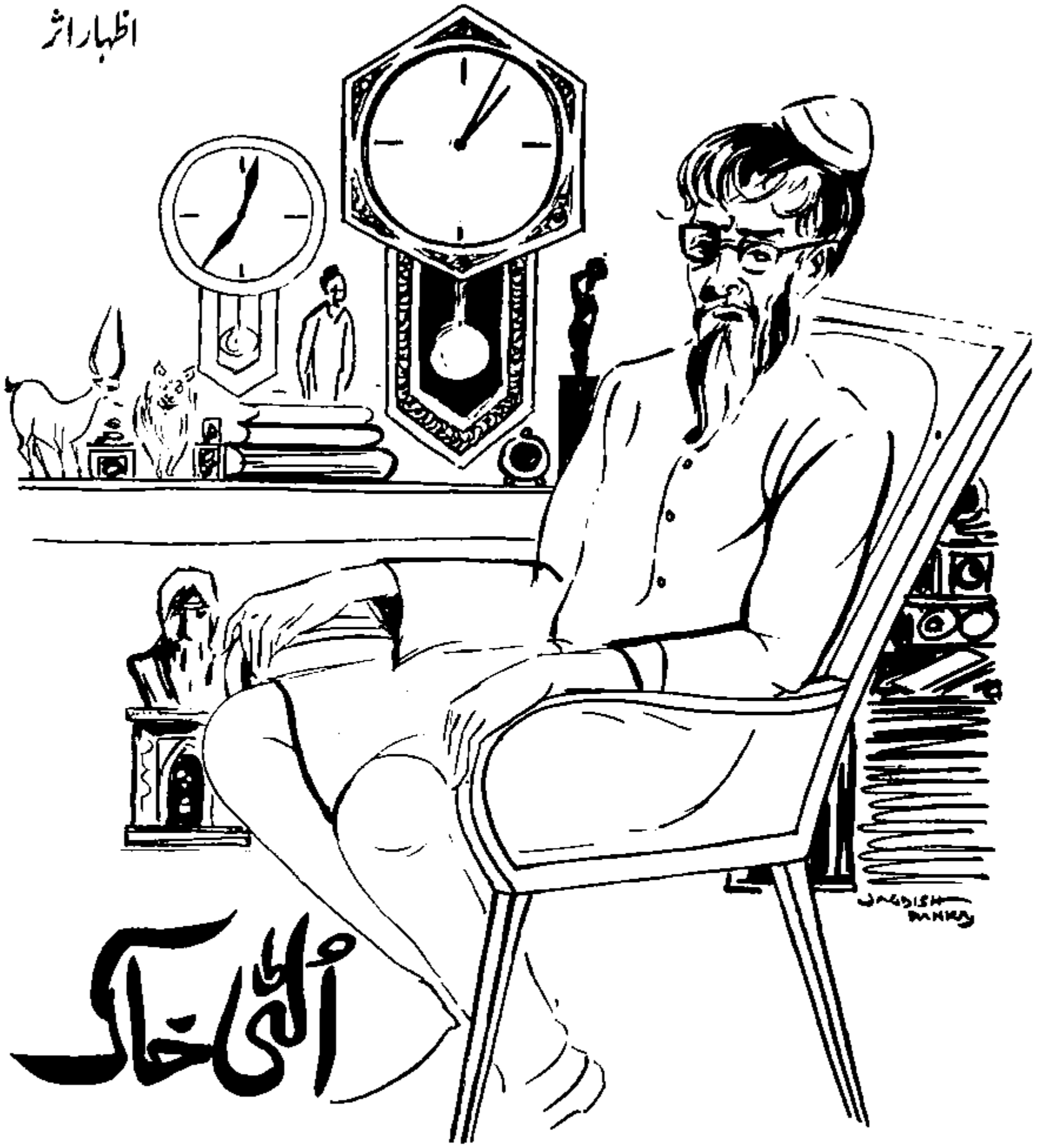
بوڑھے چچا ریاض کا اس دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ اس کے باوجود سارے شہر سے ان کا رشتہ تھا' کیوں کہ ہر شخص ان کو "چچا" کہتا تھا۔

چچا ریاض کی دوکان اگرچہ کباڑ خانہ تھی' لیکن نظر والوں کے لئے اس دوکان میں خزانہ تھا۔ وہ پرانی اور نایاب چیزیں خریدنے میں

ماہر تھے۔ ان کا سامان گروی رکھنے کا بھی کاروبار تھا جسے اکثر خریدار چھڑانے کے لیئے واپس نہیں آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا مکان، جو دوکان کے فرائض بھی انجام دیتا تھا، اچھا خاصا عجائب گھر بن گیا تھا۔

مکان کے تین کمروں میں مختلف قسم کی گھڑیاں، عجیب عجیب شکل کے پرانے برتن کچھ ثابت کچھ ٹوٹے پھوٹے مجسمے، دھات کے بنے ہوئے گھوڑے، ہاتھی، شیر، زنگ آلود اوزار اور دیمک لگی ہوئی کتابیں غرض کیا چیز نہیں تھی جو ان کے یہاں نہیں مل سکتی تھی۔

چچا ریاض کو اپنی زندگی میں صرف دو ہی شوق تھے۔ ایک کتابیں پڑھنے کا اور دوسرے دولت جمع کرنے کا۔ کتابیں پڑھنے کے شوق میں انہوں نے اچھی خاصی لائبریری جمع کر رکھی تھی جس میں نئی کتابوں کے علاوہ گلی سڑی، پھٹی پرانی کتابیں بھی شامل تھیں۔ لوگوں نے اکثر دیکھا تھا کہ وہ رات کو تین تین بجے تک زیرو واٹ کے بلب کی روشنی میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ زیادہ طاقت کا بلب وہ اس لیئے استعمال نہیں کرتے تھے کہ بجلی خرچ ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی آنکھیں جواب دے گئیں اور رفتہ رفتہ وہ پڑھنے کی قوت سے محروم ہو گئے۔

چچا ریاض کے صرف تین دوست تھے۔ بلکہ انہیں دوست بھی نہیں کہا جا سکتا، ملنے والے کہہ لیجئے۔ ایک ان کا وکیل، ایک ان کا ڈاکٹر اور ایک ان کی پڑوسن مس رضیہ۔ ڈاکٹر جمال نوجوان اور خوب صورت تھا۔ چچا ریاض کی دوکان کے سامنے ہی اس کی دوکان تھی۔ اسے روپے کی زیادہ پروا نہ تھی۔ صرف پڑوسی ہونے کے ناطے وہ ان کی صحت کی دیکھ بھال رکھتا۔ وہ کبھی کبھی کہا کرتا تھا: "چچا اتنی دولت جمع کر کے کیا کر دگے؟ اس روپے کو ٹھاٹ سے خرچ کرو تین چار ملازم رکھو، اچھا کھاؤ اچھا پہنو اور عیش کرو۔ یہ سارا روپیہ کس کے لئے چھوڑ جاؤ گے؟"

اس پر چچا ریاض ہمیشہ قہقہہ لگاتے اور کہتے: "برخوردار زندگی سے لطف اندوز ہونے کا ہر شخص کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ مجھے دولت جمع کرنے میں کتنا لطف ملتا ہے۔"

یہ خاص بات تھی کہ چچا نے اپنی دولت کو کبھی نہیں چھپایا۔ وہ روایتی کنجوسوں کی طرح خود کو غریب کبھی نہیں بتاتے تھے۔

دوسرا شخص ان کا قانونی مشیر مسٹر عنایت، ایڈووکیٹ تھا۔ کبھی کبھی جب کوئی سامان گروی رکھنے والا ان کو پریشان کرتا تھا تو وہ مسٹر عنایت سے ہی مشورہ لیتے تھے۔ کم از کم وکیل کی فیس ادا کرنے میں انہوں نے کبھی کنجوسی نہیں دکھائی تھی۔

تیسری ہستی رضیہ تھی۔ رضیہ کے ماں باپ مر چکے تھے صرف ایک بوڑھی نانی تھی جس کے ساتھ وہ برابر والی بلڈنگ کے ایک کونے میں رہتی تھی۔ وہ کسی فرم میں ٹائپسٹ تھی۔

رضیہ کو چچا ریاض پر بہت رحم آتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ بوڑھے ہو گئے تو وہ اکثر ان کو آ کر اخبار سنایا کرتی تھی، یا ان کی دل پسند کتابیں پڑھ کر سناتی تھی۔

چچا ریاض کی نظر میں دو شخص اس دنیا میں سب سے زیادہ بے وقوف تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر جمال تھا جو ان سے دواؤں کے پیسے بھی بہت کم لیتا تھا، اور بہت سے دوسرے مریضوں کا بھی مفت علاج کر دیتا تھا، اور دوسری رضیہ تھی جو بغیر کسی فائدے کے اپنا قیمتی وقت چچا ریاض کے سرہانے بیٹھ کر کتابیں پڑھ کر سنانے میں گذار دیتی تھی۔

ایک روز چچا ریاض یکایک مر گئے۔ ان کی موت کا اور کسی کو افسوس ہو یا نہ ہو، کم از کم ڈاکٹر جمال اور رضیہ کو ضرور افسوس تھا۔ بلکہ رضیہ کی تو آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔

ان کے کفن دفن کے بعد مسٹر عنایت ایڈووکیٹ نے آس پاس کے دس پانچ آدمیوں کو جمع کر کے چچا کا وصیت نامہ پڑھ کر سنایا جو وہ چھ مہینے پہلے تیار کر کے ایک بینک میں رکھوا گئے تھے اور جس کی ایک نقل مسٹر عنایت کے پاس تھی۔ [illegible] بھی مسٹر عنایت نے ہی تیار کیا تھا۔
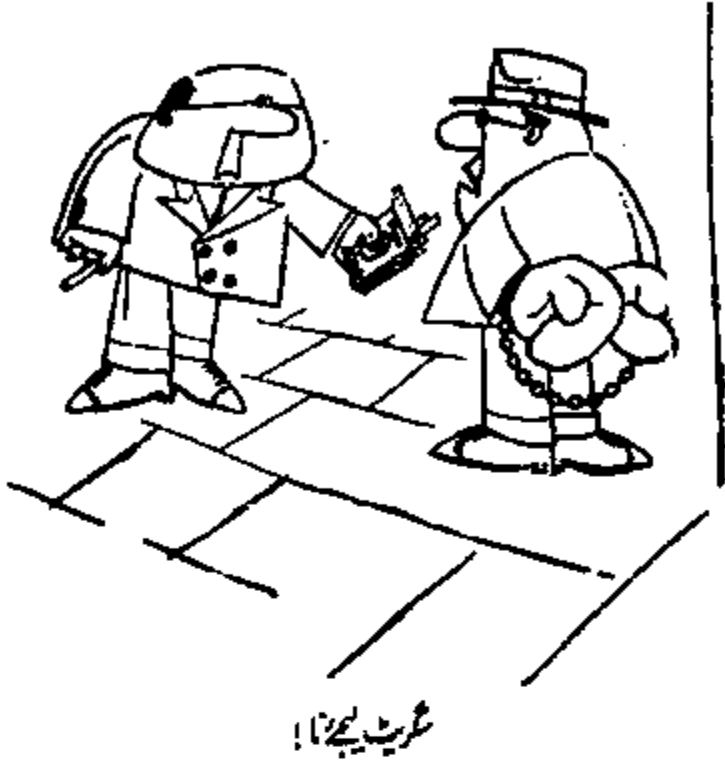
وصیت نامہ میں لکھا گیا تھا:

میں اپنی تمام جائداد، تمام سامان، تمام
دولت صرف دو شخصوں کے نام چھوڑتا ہوں،
کیوں کہ اتنی بڑی دنیا میں صرف یہی دو شخص
ایسے تھے جو بغیر کسی غرض کے مجھ سے ہمدردی
رکھتے تھے۔ ایک ان میں سے رضیہ ہے۔۔۔۔

"میں" اپنا نام سن کر رضیہ چلائی، اور اس بار اس کی
آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے۔

مسٹر عنایت وکیل نے وصیت نامہ پڑھتے ہوئے کہا!

۔۔۔۔ اور دوسرے ڈاکٹر جمال ہیں۔ چنانچہ میری
تمام جائداد اور سامان فروخت کرکے ان دونوں
میں برابر تقسیم کر دیا جائے، یا جس طرح یہ دونوں
چاہیں آپس میں معاملہ طے کرلیں۔

میرے اسی مکان میں میری زندگی بھر کی
کمائی چار لاکھ روپے کے جواہرات ہیں۔ یہ کل رقم
ان دونوں کی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ اتنی
بڑی رقم حاصل کرنے کے لئے کوئی صلاحیت
دکھائیں۔ اسی لئے میں نے اس چار لاکھ کی رقم
کو اسی مکان میں چھپا دیا ہے۔ اگر یہ دونوں عقل
سے کام لیں گے تو یہ رقم ان کی ہے ورنہ جو کچھ
ملا ہے اس پر صبر کریں۔

تین دن گذر گئے۔ رضیہ اور جمال کا برا حال ہوگیا۔ ان دونوں
نے مل کر سارے مکان کی تلاشی لے ڈالی۔ سارا فرش کھود ڈالا ــــ
تہہ خانے میں ایک گز گہرا گڑھا کر ڈالا۔ دیواروں کو ٹھونک ٹھونک
کر زخمی کر دیا لیکن چار لاکھ روپے کے جواہرات کہیں نہ ملے۔

اس ان تھک محنت سے ان دونوں کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ
ڈاکٹر جمال نے رضیہ کی نانی کے پاس رضیہ سے شادی کے لئے اپنا

سگریٹ لیجئے نا!

پیغام بھجوا دیا، جو فوراً منظور ہوگیا۔

سی آئی ڈی انسپکٹر پرویز بھی اسی محلے میں رہتے تھے۔ وہ
بھی چچا ریاض سے اچھی طرح واقف تھے۔ خاص طور پر ان کا لڑکا
راشد چچا ریاض کی دوکان سے اکثر عجیب عجیب چیزیں خرید کرلاتا رہتا
تھا۔ کیوں کہ قدیم، نادر اور نایاب چیزیں جمع کرنے کا اسے جنون تھا۔
راشد کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی۔ وہ ہائر سیکنڈری میں سائنس
کا طالب علم تھا۔

انسپکٹر پرویز اپنی ذہانت کے لئے سارے شہر میں مشہور
تھے۔ انہوں نے ایسے ایسے پُرپیچ اور پُراسرار جرائم کے راز کھولے
تھے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اخبار والے ان کی تعریف کرتے
کرتے نہ تھکتے تھے۔

مسٹر عنایت ایڈووکیٹ نے ڈاکٹر جمال اور رضیہ کو مشورہ
دیا: "آپ لوگ انسپکٹر پرویز کی مدد لیں۔ چھپے ہوئے خزانے اور پُراسرار
مجرم تلاش کرنے میں وہ ماہر ہیں۔"

ڈاکٹر جمال انسپکٹر پرویز کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ چنانچہ اس نے
انسپکٹر پرویز کو مدد کے لئے بلایا۔ انسپکٹر پرویز نے اپنے بیٹے سے کہا
"آؤ بیٹا راشد ہم چچا ریاض کا خزانہ تلاش کرنے چلتے ہیں۔" ڈاکٹر جمال

نے ہمیں بلایا ہے ۔"

چچا ریاض کے عجائب گھر نما مکان میں پانچ آدمی جمع تھے ——— رضیہ، ڈاکٹر جمال ایڈووکیٹ عنایت، انسپکٹر پرویز اور راشد۔

انسپکٹر پرویز نے ہر اس چیز کو دیکھ لیا تھا جس میں خزانہ چھپا ہو سکتا تھا۔ مثلاً انہوں نے میزوں میں خفیہ خانے تلاش کئے، مسہری اور میزوں کے پایوں کو گھما پھرا کر دیکھا کہ ممکن ہے وہ اندر سے کھوکھلے ہوں اور کسی کمانی سے کھل جاتے ہوں۔ دھات کے بنے ہوئے ایک ہاتھی پر انہوں نے خاص طور پر توجہ دی لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے مجسموں کو اچھی طرح جانچا پرکھا۔ لیکن خزانہ نہ ملا۔

دو تین گھنٹے کی محنت کے بعد وہ بھی مایوس ہو گئے۔ انہوں نے ایک بار وصیت نامہ خود پڑھا اور مسٹر عنایت سے پوچھا: "یہ وصیت نامہ آپ نے کب تیار کیا تھا؟"

"چھ مہینے پہلے۔" مسٹر عنایت نے جواب دیا۔

"کہاں؟"

"اسی کمرے میں۔" اس وقت وہ چچا ریاض کی خواب گاہ میں تھے۔ اس کمرے میں کتابیں اس طرح بکھری پڑی تھیں جیسے طوفان آیا ہو اور کتابیں بھی سیکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ نئی، پرانی، گلی سڑی فلسفہ، معاشیات، سائنس، ناول، افسانے، غرض ہر قسم کی کتابیں وہاں پھیلی پڑی تھیں۔ چاروں دیواروں پر بڑی بڑی پرانی ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویریں ٹنگی تھیں۔ ایک طرف کسی اناڑی مصور کا بنایا ہوا "کبوتر محل" تھا۔ یہی اس کے نیچے بھی نام لکھا تھا۔ دوسری طرف ایک گل دان کی تصویر تھی۔ تیسری طرف ایک شکاری کو دکھایا گیا تھا اور چوتھی دیوار پر خود چچا ریاض کے بچپن کی تصویر تھی۔

کھڑکیوں میں لکڑی، کانسے، اور پیتل کے مجسمے رکھے تھے۔ ان میں انسانوں کے بھی مجسمے تھے اور جانوروں کے بھی۔

انسپکٹر پرویز نے سوال کیا: "مسٹر عنایت، جب آپ یہ وصیت لکھ رہے تھے تو کیا چچا ریاض نے کچھ اشارہ نہیں دیا تھا کہ انہوں نے جواہرات کہاں رکھے ہیں؟"

"میں نے ان سے پوچھا تھا۔" مسٹر عنایت نے جواب دیا: "تو انہوں نے ہنس کر کہا تھا۔ میرے دوست میرے خزانہ کا راز اسی کمرے میں موجود ہے۔"

"اسی کمرے میں۔" انسپکٹر پرویز سوچنے لگے۔ پھر یکایک وہ کتابوں کے ڈھیر پر جھک گئے اور ایک ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگے ——— وہ کتاب اٹھاتے تھے، اس کا نام پڑھتے تھے اور پھینک دیتے تھے۔ ساری کتابیں دیکھنے کے بعد انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ڈاکٹر جمال سستانے کے لئے آٹھ دس کتابوں کے ڈھیر پر بیٹھے تھے۔ انسپکٹر پرویز نے ان کو اٹھا کر کہا: "آپ شاید خزانہ پر بیٹھے ہیں ——— ڈاکٹر جمال اٹھ گئے۔ انسپکٹر نے ان کتابوں کو دیکھا اور اچانک ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ کوئی تین سو صفحات کی ایک کتاب اٹھا کر پہلے انہوں نے اس کی جلد کو اچھی طرح دیکھا، پھر اس کی ورق گردانی کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے کتاب کا پہلا صفحہ کھولا اور سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: "کیا چچا ریاض کے سامان میں کوئی پیلے رنگ کا کتا ہے؟"

"نہیں ———" رضیہ نے کہا ——— "نیلے رنگ کی ایک بلی ضرور ہے۔"

"کیا اس مکان میں کوئی آتش دان کی چمنی ہے؟" انسپکٹر پرویز نے پھر پوچھا۔

"جی نہیں ———" ڈاکٹر جمال نے جواب دیا: "اس مکان میں آتش دان ہی نہیں۔"

"کیا یہاں کوئی تیر انداز کا مجسمہ ہے؟"

"صرف ایک تصویر ہے۔" رضیہ نے کہا: "دوسرے کمرے

میں ـــــ"

اسی طرح انسپکٹر نے پانچ چھ چیزوں کے بارے میں پوچھا جب ہر بات پر سے نفی میں جواب ملا تو ان کے چہرے پر الجھن کے آثار پھیل گئے۔ انہوں نے کہا: "اگر خزانے کا راز اسی کمرے میں پوشیدہ ہے تو اسی کتاب میں ہونا چاہئے، کیوں کہ ان سینکڑوں کتابوں میں سے ایک کتاب اس وقت تک نہیں تلاش کی جا سکتی جب تک کوئی واضح اشارہ نہ ہو۔ اس کتاب کا نام ہے: "چار لاکھ"۔ مصنف کوئی ہیرالال ہے۔ یہ دونوں نام خاص اشارے ہیں۔ میں نے اس کتاب کے تمام عنوانات پڑھ لئے۔ ہر باب کا الگ عنوان ہے۔ پہلا کتا۔ آتش دان کی چمنی۔ تیر انداز۔ بھوری آنکھیں۔ قاتل طوطا۔ لیکن ان چیزوں سے ملتی جلتی کوئی چیز یہاں نہیں ہے۔ اب صرف آخری عنوان رہ گیا ہے ـ" الٹی خاک"۔ کیا آپ لوگ کچھ سوچ سکتے ہیں؟ ویسے یہ مجھے یقین ہے کہ خزانے کا راز اسی کتاب میں پوشیدہ ہے۔"

ہر ایک نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر جمال نے کہا: "میں مرض تلاش کر سکتا ہوں، خزانہ نہیں۔ ہم واقعی اس خزانہ کو حاصل کرنے کے حق دار نہیں ہیں۔"

رضیہ نے کہا: "کہیں یہ چچا ریاض کا مذاق نہ ہو۔"

"مذاق نہیں ہو سکتا۔" مسز عنایت نے کہا: "چچا ریاض کے پاس اتنی دولت ہونی چاہئے۔"

یکایک راشد چلّایا: "ابو جان ـــــ میں سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھ گئے؟" انسپکٹر پرویز نے حیرت سے کہا۔

"یہی کہ "الٹی خاک" کا کیا مطلب ہے اور خزانہ کہاں ہے۔"

"کہاں ہے؟" انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

راشد نے "بھوت محل" کی تصویر کی جانب اشارہ کر کے کہا: "اس تصویر کو اتروائیے۔"

فوراً تصویر اتار لی گئی۔ راشد نے کہا: "اس کا فریم کھولئے۔

جیل میں قیدیوں کو اسی طرح نہلایا جاتا ہے۔

خزانہ اس تصویر میں ہونا چاہئے۔"

انسپکٹر پرویز نے ایک قہقہہ لگا کر کہا: "بیٹا خزانہ ہیرے جواہرات کی شکل میں ہے۔ اس میں کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن 'الٹی خاک' کا اشارہ اس تصویر کی جانب ہے۔ اس کا فریم کھولئے۔"

انسپکٹر پرویز جانتے تھے کہ ان کا بیٹا کافی ذہین ہے، چنانچہ اس کی تسلی کے لئے انہوں نے فریم کھلوا دیا۔

اور وہ سب لوگ حیران رہ گئے جب انہوں نے دیکھا کہ تصویر کی پشت پر گتّے کے پیچھے ایک مُہر بند لفافہ رکھا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔

مبارک باد ـــــ تم واقعی ذہین ہو۔
اب خزانہ حاصل کرنے کے لئے یہ لفافہ کھولو۔

ریاض

ہر شخص کے مونہہ سے خوشی کا ایک نعرہ نکلا: "مل گیا!" ڈاکٹر جمال نے جوش میں آ کر راشد کو گود میں اٹھا لیا اور ناچنے لگا۔

انسپکٹر پرویز نے کہا: "لیکن بیٹے تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ

اس تصویر میں کوئی راز ہے۔" راشد نے مسکرا کر کہا۔

"ابو جان، بالکل صاف بات ہے۔ آخری عنوان ہے "الٹی خاک" اب ذرا آپ خاک کو الٹیے۔ دیکھئے خاک کے حروف ہیں خ۔ا۔ک۔ ان کو الٹا کر دیجئے۔ ک۔ا۔خ۔ اس طرح ایک بامعنی لفظ بن گیا "کاخ" اور کاخ کے معنی محل ہوتے ہیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ضرور اس بھوت محل کی تصویر کی جانب اشارہ ہے۔"

"بہت خوب، بہت خوب۔" وکیل مسٹر عنایت نے راشد کی کمر تھپکتے ہوئے کہا۔

لیکن ان سب لوگوں کی خوشی خاک میں مل گئی جب انہوں نے لفافے کے اندر کا خط پڑھا۔ اس خط میں لکھا تھا:

اس میں شک نہیں کہ تم لوگ ذہین ہو
لیکن ابھی میری تسلی نہیں ہوئی۔ چار لاکھ ایک
دن میں حاصل کرنا آسان نہیں۔ ابھی ایک امتحان
باقی ہے۔ آنکھیں کھول کر پڑھو، سوچو کہ وہ
انسان بے وقوف ہے جو کھلی آنکھیں رکھنے
کے باوجود کچھ نہ دیکھے۔

خزانہ کا اصل پتہ اسی خط میں موجود ہے
اور نہایت صاف اور واضح اشارہ ہے۔ عقل
ہے تو آگے بڑھ کر خزانہ حاصل کر لو۔

اس خط کے نیچے چچا ریاض کے دستخط نہیں تھے، بلکہ صرف ایک ٹوٹی ہوئی تلوار کا نقشہ بنا ہوا تھا، جو اس طرح تھا:
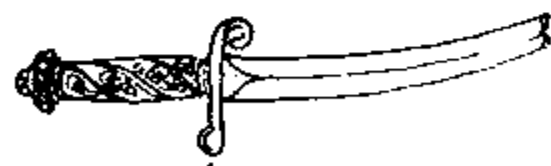
خط پڑھ کر سب لوگ خاموش رہ گئے۔

یہ دوسرا معمہ ہے ۔۔۔" مسٹر عنایت نے کہا۔

یکایک ڈاکٹر جمال چلایا، "میں سمجھ گیا ۔۔۔ بائی گاڈ، اس بار میں نے معمہ حل کر لیا۔ آج مجھے پتہ چلا کہ میں بھی جاسوس بن سکتا ہوں ۔۔۔"

"کیا سمجھ گئے؟" رضیہ نے پوچھا۔

جمال تیزی سے کمرے کی طرف بڑھا اور تقریباً چھ انچ لمبا ایک مجسمہ اٹھا لایا۔ یہ کسی سپاہی کا مجسمہ تھا، جس کے ہاتھ میں آدھی ٹوٹی ہوئی تلوار تھی۔ "یقیناً جواہرات اس مجسمے میں ہیں۔" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

بات معقول تھی۔ آدھی تلوار کے نقشے کا اشارہ اسی تلوار والے مجسمے کی طرف ہو سکتا تھا۔

چنانچہ فوراً مجسمے کو ہتھوڑوں سے توڑا گیا ۔۔۔ لیکن مجسمہ خالی تھا۔

ڈاکٹر جمال کا چہرہ اتر گیا ۔۔۔ پھر سب لوگ سر جوڑ کر سوچنے لگے۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر پرویز نے کہا "میرا خیال ہے تلوار کا نقشہ محض چکرانے کے لئے ہے۔ اصل اشارہ آنکھوں کی طرف ہے۔ کیا یہاں کوئی ایسا مجسمہ ہے جس کی آنکھیں کھلی ہوں لیکن اس میں پتلیاں نہ ہوں؟"

"ہے۔" رضیہ چلائی اور تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

چند منٹ بعد وہ سنگ مرمر سے بنا ہوا ایک مجسمہ لے آئی۔ یہ کسی خوب صورت عورت کا مجسمہ تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن آنکھوں میں پتلیاں نہیں تھیں، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

مجسمہ توڑ دیا گیا ۔۔۔ جواہرات اس میں بھی نہیں تھے۔

اسی طرح آدھے گھنٹے تک وہ دماغ ریزی کرتے رہے لیکن خزانہ نہیں ملا۔

اتنے میں انسپکٹر پرویز نے دیکھا کہ راشد کی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ انہوں نے کہا "کیوں بیٹے ۔۔۔ کچھ تمہاری سمجھ میں آیا؟"

راشد نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے، میں نے آپ کے جواہرات تلاش کر لئے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" ہر شخص نے ایک ساتھ پوچھا۔

راشد نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک کھڑکی کی جانب اشارہ کر کے کہا "ذرا وہ پیتل کا شیر اُٹھا لائیے !"

کھڑکی میں کوئی نو انچ لمبا پیتل کا ایک شیر رکھا تھا جس کی آنکھوں میں سرخ شیشہ لگا تھا ۔ ڈاکٹر جمال نے شیر کا مجسمہ اُٹھا لیا ۔

راشد نے کہا "جواہرات اس شیر میں ہونے چاہئیں ۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے ؟" مسٹر عنایت نے کہا ۔۔۔ "یہ پیتل کا ڈھلا ہوا مجسمہ معلوم ہوتا ہے ۔"

"ابو ! آپ ذرا اس شیر کی آنکھیں دبائیے ۔ مجھے یقین ہے اس شیر میں کوئی کمانی ضرور ہوگی جس سے اس کا پیٹ یا منہ کھلتا ہوگا ۔۔۔"

انسپکٹر پرویز نے شیر کا مجسمہ ہاتھ میں لے کر اس کی دونوں آنکھیں دبائیں ۔ اس کے ساتھ ہی ہر شخص کے حلق سے حیرت کی ایک چیخ نکل گئی ۔۔۔ کیوں کہ آنکھیں دب کر اندر چلی گئیں اور شیر کا نچلا جبڑا کھڑکی کی طرح نیچے گر پڑا ۔

اندر چمڑے کی ایک تھیلی کے اندر چار لاکھ کے جگمگاتے ہوئے جواہرات موجود تھے ۔

اس بار وہ سب لوگ واقعی خوشی سے پاگل ہو گئے ۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب سب کے جوش سرد ہوئے تو ایڈوکیٹ مسٹر عنایت نے پوچھا "بھئی راشد میاں ، ہم بڑے سب تم سے ہار مان گئے ۔ کم از کم ہم لوگ اس خزانے کو تلاش نہیں کر سکتے تھے ۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ جواہرات اس شیر کے اندر ہیں ؟"

راشد نے شرماتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے ابو ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے شیر کا پتہ کیسے چلایا ۔"

"ہاں ۔" انسپکٹر پرویز نے مسکراتے ہوئے کہا "میں سمجھ گیا ہوں بیٹا ! لیکن تم ہی ان لوگوں کو بتاؤ ۔۔۔ اشارہ واضح اور صاف تھا ۔۔۔ شمشیر میں ۔۔۔"

"جی ہاں ۔۔۔" راشد نے کہا "خط کے نیچے آدھی تلوار

ارے ۔۔۔ یہ اپنی اس مہینے کی تنخواہ تو لیتے جاؤ ۔۔۔ !

بالکل صاف اشارہ ہے ۔"

"کس طرح ؟" رضیہ نے سوال کیا ۔

راشد نے کہا "دیکھئے تلوار کو شمشیر بھی کہتے ہیں ۔ چونکہ پہلے اشارے میں چچا ریاض نے الفاظ سے اشارہ بنایا تھا اس لئے میں نے سوچا کہ اس بار بھی اشارہ حروف میں ہی ہوگا ۔ اب ذرا آپ شمشیر لکھیئے ۔ ش ۔ م ۔ ش ۔ ی ۔ ر ۔ لفظ شمشیر کے اصل میں دو حصے ہیں ۔ ایک شم ۔۔۔ دوسرا شیر ۔ اب چچا ریاض نے آدھی شمشیر کا نقشہ بنایا ہے ، اس لئے لفظ شمشیر کا آخری نصف حصہ پڑھیئے ۔ اور اسے شیر کی بجائے شیر پڑھیئے ۔۔۔ اس طرح میں سمجھا کہ خزانہ کسی شیر کے مجسمے میں ہونا چاہیئے ۔ اور جہاں تک شیر کی کمانی کھلنے کا تعلق ہے ، اس کا تذکرہ وہ اپنے خط میں صاف طور پر کر چکے ہیں ۔ بار بار انہوں نے آنکھوں کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خاص طور پر ہماری توجہ آنکھوں کی جانب دلانا چاہتے تھے ۔

"بائی گاڈ ۔۔۔ ایڈوکیٹ مسٹر عنایت نے کہا ۔۔۔ "انسپکٹر پرویز ! تمہارا بیٹا دنیا کا سب سے ذہین جاسوس ہے ۔ خدا اس کی زندگی سلامت رکھے ۔ یہ تم سے زیادہ شہرت حاصل کرے گا ۔"

اپنی تعریف سُن کر راشد کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا ۔

خوفناک جزیرہ
سراج انور کا لکھا ہوا ایک
عجیب و غریب ناول، ڈرپوک
اور کمزور دل کے لوگ اسے نہ
پڑھیں۔
قیمت ۵ روپے

ستاروں کے قیدی
چاند کی دنیا میں دو بچے قید
ہو گئے۔ انوکھی کہانی۔ رات
کو پڑھیں تو دُگنا لطف
آئے گا۔ ظفر پیامی نے
لکھا ہے قیمت ۲ روپے

چڑیوں کی الف لیلیٰ
(چار حصے)
کرشن چندر کی لکھی ہوئی ایک
مسلسل کہانی۔ پہلا حرف پڑھ کر
آخر تک پڑھے بغیر چین نہیں آتا
قیمت ۴ روپے

گھسیٹا کی بھتنا شاہی
گھسیٹا کو بھوت سمجھ لیا گیا
اور پھر لوگ اس سے
ڈرتے رہے۔
نئی قسم کی منظوم کہانی۔
قیمت ۶۵ نئے پیسے

سمندر کی شہزادی
مچھلیوں کی شہزادی انسان
بن کر دنیا میں آئی
اس کی زبان کاٹ ڈالی گئی
حیرت انگیز کہانی۔
قیمت ۱۲۴ نئے پیسے

کامیابی کی راہیں
(دو حصے)
صدر الشفا نے بچوں کے لئے
کامیابی کی نئی راہیں نکالی
ہیں۔ ضرور پڑھئے۔
قیمت ایک روپیہ

جادو کا دروازہ
ہزاروں سال پرانی
لاش کے پاس ایک خزانہ
کا راز تھا جسے حاصل
کرنے والا مر جاتا تھا۔
قیمت صرف ۵۰ نئے پیسے

سات رنگ کی
با تصویر کہانیاں
شیر کا انعام۔ قد چوک جوہا
ظالم بلی۔ بے وقوف بندر
بے وقوف راجہ۔ بچے دوست
کمزوروں کون
پورا سیٹ ۲ روپے ۸۰ نئے پیسے

شریر لڑکا
ایک لڑکے نے
اپنی نوکرانیوں کو
زندہ جلا دیا تھا۔ آپ
جو مصیبت بن گئیں۔
قیمت ۵۵ نئے پیسے

سرکس کے کھیل
پڑھ کر یہ معلوم ہوگا
کہ آپ
کسی بہت بڑے سرکس
میں تماشہ دیکھ رہے ہیں
قیمت صرف ۵۰ نئے پیسے

خونی ڈاکو
خطرناک
ڈاکو کی
دل ہلا دینے والی
کہانی
قیمت ۴۴ نئے پیسے

شیخ چلی کی کہانیاں
بیسیوں کہانیوں پر ایک
شیخ چلی کی پوری داستان
مکمل سیٹ
قیمت ۴ روپے

بھوتوں کا خزانہ
بھوت سے خزانہ حاصل
کرنے کی کہانی جو
دلچسپ بھی ہے
انوکھی بھی
قیمت ۶۵ نئے پیسے

مالو کے کارنامے
عشرت رحمانی نے تبدیلی
کہانی لکھی ہے جو
مزے دار ہے
۶۵ نئے پیسے

جادو کا ہار
غریب لڑکے نے
جادو کے ہار کی مدد
سے شہزادی سے شادی
کرلی۔ جادو کے
ہار کا کرشمہ قیمت ۴۴ نئے پیسے

شیر کی بیٹی
قیمت ۴۴ نئے پیسے

سونے کی صندوقچی
کرشن چندر
کی لکھی ہوئی کہانی
جو اس قدر دلچسپ ہے کہ
بار بار پڑھنے کو دل چاہتا
ہے قیمت ۵۴ نئے پیسے

تعلیمی تاش کے کھیل
اردو
ہندی
انگریزی

کامیاب ڈکشنریاں
جیبی پاکٹ ڈکشنری
اردو۔ ہندی۔ انگریزی ۳-۰۰
پائنیر ڈکشنری
اردو۔ انگریزی ۱۱-۵۰
پائنیر ڈکشنری
انگریزی اردو ۱۵-۰۰

کھلونا ۔۔۔ بک ڈپو ۔۔۔ آصف علی روڈ ۔۔۔ نئی دہلی

چنداپور

اُجاگر وارثی

آؤ چلیں ہم چنداپور
چنداپور نہیں اب دُور
جانے کیوں یہ دادی اماں اکثر کہتی رہتی ہیں
برفی کے ہیں پیڑ وہاں پر دودھ کی نہریں بہتی ہیں
کھولیں گے یہ بھید ضرور
آؤ چلیں ہم چنداپور
راکٹ ایسے تیز بنائیں جو تیروں کو شرمائیں
کھلی فضا میں یوں لہرائیں بادل تکتے رہ جائیں
ہم کو ہے بس یہ منظور
آؤ چلیں ہم چنداپور
ٹم ٹم کرتے تارے ہم کو خوش ہو کر دیں ہاتھوں ہاتھ
ٹھنڈے ٹھنڈے آنگن میں سب گاتے ہنستے جھولیں ساتھ
چھم چھم ناچے نور ہی نور
آؤ چلیں ہم چنداپور
چنداپور نہیں اب دُور
آؤ چلیں ہم چنداپور

رینکی کو دو ہی شوق تھے۔ ایک گڑیوں کا دوسرا پھولوں
کئی قسم کی گڑیاں اس کی ممی نے اور اس کے پاپا نے اسے
لا دی تھیں اور طرح طرح کے پھول وہ خود اپنے باغیچے میں سے
چن لیتی تھی۔ پھولوں کے ہار اور گجرے بنا کر وہ گڑیوں کا سنگار
کرتی اور ان کے گل دستے بنا کر وہ گڑیوں کا گھر سجاتی۔ گھر کے
ایک کونے میں اس نے "گڑیا گھر" بنا رکھا تھا، جو بھینی بھینی خوشبو

سے ہر وقت مہکتا رہتا۔ رنگ برنگے کپڑے پہنے گڑیاں خوب صورت پھولوں کے بستروں پر لیٹی رہتیں۔

وہ ہر دوسرے تیسرے دن پھول بدل ڈالتی۔ گھر کے باغیچے میں پھول کھلتے بھی بہت تھے اور ان میں سے دس پندرہ پھول روزانہ چن لینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھول کھلتے اور گڑیا کے گھر میں پہنچ جاتے۔ لیکن پچھلے ایک ہفتے سے سُرخ گلاب کا ایک پھول گڑیا گھر کی زینت بنا ہوا تھا۔ پھول مرجھا چکا تھا۔ لیکن پنکی اسے بڑی حفاظت سے گڑیا گھر کے ایک کونے میں رکھے ہوئے تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گڑیا گھر کے پاس بیٹھی ہوتی تو اس پھول کو اٹھا کر بار بار سونگھتی اور پھر آہستہ سے بڑے پیار کے ساتھ، وہ اسے اس کی جگہ پر رکھ دیتی۔

اس کی سہیلیاں کہتیں، "پنکی! یہ پھول تو اب سوکھ گیا ہے اسے پھینک دو۔"

وہ فوراً جواب دیتی، "ارے کہاں سوکھا ہے یہ؟ دیکھو تو کتنی خوش بُو ہے اس میں۔"

اور وہ انہیں گلاب سونگھنے کے لئے دے دیتی۔ سہیلیوں کو اس میں کوئی خاص خوش بُو نہ آتی۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر گلاب اسے واپس کر دیتیں۔ لیکن پنکی ان کے ہاتھ سے گلاب لیکر پھر اُسے سونگھتی اور سرشار سی ہوکر آنکھیں بند کر لیتی اور کہتی، "یہ پھول تو کبھی سوکھ ہی نہیں سکتا ـــــ کبھی نہیں ـــــ ہاں۔"

پنکی کا بھائی ٹونی، جو اس سے چار سال بڑا تھا، بہت شریر تھا۔ وہ کئی بار گڑیا گھر برباد کر چکا تھا۔ اب کی بار جو وہ اس سے کسی بات پر جھگڑا تو بدلہ لینے کے لئے اس نے سب پھول وہاں سے اٹھا لئے۔ اور اُن میں سُرخ گلاب کا وہ پھول بھی تھا۔

پنکی سکول سے واپس آئی تو اس نے گڑیا گھر کی ابتر حالت دیکھی۔ اسے وہ گلاب کا پھول نظر نہ آیا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ روتی ہوئی ممی کے پاس گئی۔

ممی نے اسے دلاسہ دیا۔ "جاؤ، تم باغیچے میں سے اور پھول توڑ لو۔ وہ شیطان نہ جانے کہاں گیا ہے اس وقت۔"

لیکن پنکی کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔

"ممی! اُن پھولوں میں میرا سرخ گلاب کا پھول بھی تھا۔ وہ بھی نہیں ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تو کوئی بات نہیں بیٹا۔ سُرخ گلاب کا پودا ابھی تو اپنے باغیچے میں ہے۔ تم اس میں سے پھول توڑ لو۔"

"نہیں ممی ـــــ میرا وہ پھول ـــــ مجھے وہی پھول چاہیئے ـــــ میرا وہ پھول مجھے دلا دیجئے ممی۔ ٹونی نے ضرور کہیں چھپایا ہوگا۔" پنکی کا رونا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"اُف! پاگل ہو گئی ہو کیا۔؟ اتنے سارے سُرخ گلاب کھلے ہیں ـــــ توڑ لو نا ان میں سے ایک ـــــ"

پنکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس روتی رہی ـــــ روتی رہی۔

"چپ ہو جاؤ بیٹا ـــــ چپ ہو جاؤ۔ لو میں توڑ لاتی ہوں سُرخ گلاب۔" اُس کی ممی اس کے رونے سے پریشان ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر باغیچے میں گئیں اور ڈھیر سارے سرخ گلاب توڑ لائیں اور انہیں پنکی کے سامنے رکھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

ممی تو اپنے کام میں لگ گئیں، لیکن پنکی وہیں بیٹھی سسکیاں بھرتی رہی۔ سُرخ گلاب پاس پڑے رہے لیکن اس نے انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئیں ـــــ تھوڑی دیر کے بعد اس کی ممی جو ادھر آئیں اور اسے ابھی تک روتے دیکھا تو حیران رہ گئیں! انھوں نے اسے یوں روتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ تو ہمیشہ ہنستی کھیلتی رہتی تھی، وہ اب دوسری کلاس میں پڑھتی تھی اور اس کی کلاس ٹیچر نے بھی ہمیشہ یہی کہا تھا کہ پنکی بہت ہنس مکھ

لڑکی ہے۔ اسے یوں روتا دیکھ کر اس کی ممی کو افسوس بھی ہوا اور
غصہ بھی آیا۔ بھلا، ایک باسی سوکھے ہوئے پھول کے لئے اتنا بھی
کیا رونا۔

اُسی وقت پنکی کی ہم جماعت اور سہیلی لِلی جو پڑوس ہی میں رہتی
تھی آ گئی ——— پنکی نے اسے گڑیوں سے کھیلنے کے لئے بلایا تھا
اس نے پنکی کو روتے دیکھا تو حیران کی اس کے پاس بیٹھ گئی
پنکی کی ممی نے کہا "دیکھو للی! کتنی پاگل ہے یہ۔ ایک باسی پھول کے
لئے رو رہی ہے۔ ایک سُرخ گلاب کا پھول گڑیا گھر میں رکھا تھا۔ ٹونی
نے کہیں پھینک دیا ہے ——— اور یہ روئے جا رہی ہے۔
ہے نا پاگل؟"

"ارے وہ گلاب کا پھول ———؟!" للی نے پنکی کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔ "آنٹی! وہ تو اس کو پردھان منتری اندرا گاندھی
نے دیا تھا۔ پچھلے ہفتے جب اندرا گاندھی یہاں آئی تھیں نا۔ تو ہمارے
اسکول کی لڑکیوں نے ان کے گلے میں ہار ڈالے تھے ——— اور
ہماری کلاس کی لڑکیوں نے ان کو پھولوں کے گل دستے بھینٹ کئے
تھے۔ جو لڑکیاں آگے کھڑی تھیں، ان میں پنکی بھی تھی ——— اندرا
گاندھی نے ان میں سے کئی لڑکیوں کو پھول دئے تھے۔ پنکی کو سرخ
گلاب کا پھول دیا تھا ——— وہی سُرخ گلاب جو پنکی نے گڑیا گھر میں
رکھ چھوڑا تھا۔"

"اوہو! یہ بات ہے۔" اب ممی کو بھی اس پھول کے گم ہو
جانے کا دکھ ہوا۔ انھوں نے پنکی کو گود میں کھینچ لیا اور پیار سے بولیں،
"وہی پھول تھا کیا؟"

پنکی نے آنسو بھری آنکھوں سے ممی کی طرف دیکھا، اور ہاں میں
سر ہلا دیا۔

اُسی وقت ٹونی کھیل کر گھر واپس آ گیا ———

"ارے ٹونی! ادھر آؤ، کہاں ہے وہ پھول؟"

"کون سا پھول ممی؟"

"ارے وہی سرخ گلاب کا پھول!"

ممی کی آنکھوں میں غصہ اور پنکی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ
جھٹ بول اٹھا ——— "ممی، میں نے تو وہ سارے پھول الماری میں رکھ
دئے تھے ——— ابھی لاتا ہوں۔" اور وہ دوڑ کر اندر گیا اور سارے
پھول جھولی میں بھر لایا ———

پنکی نے جلدی سے وہ سوکھا ہوا سُرخ گلاب اٹھایا اور اسے
سینے سے لگا لیا ——— ممی نے ٹونی کو بھی سُرخ گلاب کی اہمیت
بتائی ——— اور وہ سُرخ گلاب، سوکھا ہونے کے باوجود گھر بھر میں
خوش بو پھیلانے لگا۔

کام کرنے والے : محمد فرقان، عبدالمتین، محمد عمار، بشریٰ جبیں، خالد علی خاں اور خورشید احمد

کہانی : امینہ دہلوی

فوٹوگرافی : سراج انور

ہدایات : الیاس دہلوی

(تصویری کہانی مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مدد سے بنائی گئی)

فرقان اور اس کے شریر دوستوں نے ایک دن
اپنے چچا کو بے وقوف بنانے کا
ارادہ کیا اور پھر فرقان نے پبلک
ٹیلی فون سے چچا صاحب کو فون کرنا شروع کیا
شریر متین نے کاغذ کے ایک تھیلے کو پھونک
بھر کر پھلا لیا تھا!

جیسے ہی دوسری طرف سے ہیلو
کہا گیا،
فرقان نے ماؤتھ پیس تھیلے کی طرف
کر دیا۔ متین نے ایک زوردار ہاتھ تھیلے پر مارا،
بھڑاک کی
ایک گونج دار آواز بلند ہوئی

لیکن دوسری طرف خالد صاحب کے کانوں کے پردے
پھٹ گئے، ایسی آواز
آئی جیسے بم پھٹ گیا ہو!

وہ بے چارے بڑی دیر تک کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے
رہے —— دماغ جھائیں جھائیں کر رہا
تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بہرے ہو گئے ہوں

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی —— اچھا! تو
وہی شیطان ہے!
غصّے کے عالم میں وہ اس طرح فون کی طرف
بڑھے جیسے اُسے
کچّا ہی چبا جائیں گے!

ریسور اُٹھاتے ہی انہوں نے کچھ نہیں سُنا ——
بس بولتے گئے، نالائق، گدھے،
پاجی —— کھال اُدھیڑ کر رکھ دوں گا ——
سمجھا کیا ہے مجھے، بدتمیز، اُلّو،
کان اکھاڑ لوں گا کان!

لیکن دوسرے دن وہ خوف زدہ سے اپنے آفیسر کے سامنے
کھڑے تھے۔ پسینہ چھوٹ رہا تھا اور جسم
کپکپا رہا تھا، آفیسر خورشید صاحب انہیں بری طرح ڈانٹ رہے
تھے کیوں کہ وہ دوسرا والا فون خورشید صاحب
نے ہی کسی ضروری کام
کے سلسلے میں کیا تھا۔
●●

تصویر: صدیقی

تم "کھلونا" میں ہر ماہ انعامی تصویر دیکھتے ہو۔ اس تصویر کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔ اصل میں اس کا عنوان تم کو لکھنا ہے تم اس کا کوئی خوب صورت سا دل چسپ عنوان سوچو اور ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر نیچے لکھے ہوئے پتے پر ہمیں بھیج دو۔ جس کھلونا بہن بھائی کا عنوان سب سے اچھا اور دل چسپ ہوگا اُسے دو روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔ پسند آنے والے اور بھی بہت سے عنوانات شائع کئے جائیں گے۔

کارڈ بھیجنے کا پتہ: **انعامی تصویر نمبر ۲۹، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی**

ہمیں جواب ملنے کی آخری تاریخ: ۲۴ فروری ۱۹۶۹

کام کرنے والے:
سہیل احمد، صہبا اور جنید
فوٹوگرافی:
سراج انور
کہانی:
راشد انور
ہدایات:
الیاس دہلوی
(تصویری کہانی مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مدد سے بنائی گئی)

صہبا اور جنید اپنے گھر کے احاطے کے باہر گیند کھیل رہے تھے کہ انہیں ایک آدمی اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا

اُس آدمی نے قریب آکر پوچھا
بچو! تمہیں معلوم ہے اسلم صاحب کہاں رہتے ہیں؟

دونوں بہن بھائی اتنے شرارتی تھے کہ خدا کی پناہ!
صہبا نے جلدی سے ایک شرارت سوچ لی
اور پھر جنید کے کان میں کہا
"نئی چیز پھنسی ہے ـــــ ذرا اسے رگڑیں گے.
خوب بے وقوف بنائیں گے ـــــ اچھا!"

اُنہوں نے بے چارے اجنبی کو ایسا اُلٹا سیدھا پتہ بتایا کہ وہ غریب ایک چٹیل میدان میں پہنچ گیا جہاں ایک ایک بھی مکان نہیں تھا۔ صہبا اور جنید اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے اور دُور کھڑے اُس کی بے بسی کا تماشا دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں ہنستے رہے

اجنبی نے انہیں واپس آکر ڈانٹا اور کہا کہ یہ بہت بُری عادت ہے کہ تم اپنے سے بڑوں سے مذاق کرو ——— مگر صہبا اور جنید کے کانوں پر ایک بھی جُوں نہ رینگی ——— وہ ہنستے رہے

اُنہوں نے اب کے اجنبی کو صحیح پتہ بتا دیا اور وہ صحیح پتہ یہ تھا کہ اُنہوں نے اجنبی کو "کوڑا گھر" میں بھیج دیا۔ غصّے کے مارے اُس غریب کا بُرا حال تھا اور یہ دونوں شیطان اوٹ میں کھڑے ہنس رہے تھے

اجنبی نے سوچا کہ شاید نرمی سے کام چل جائے وہ پیار سے صہبا کو سمجھانے لگا کہ بچّوں کو ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔
مگر حرکت تو ہو رہی تھی۔ شریر جنید ایک پُرانی جوتی ڈوری کے ذریعے اجنبی کی پتلون میں باندھ رہا تھا

صہبا سے اسلم صاحب کا ٹھیک پتہ معلوم کر کے جیسے ہی وہ مڑا، کوئی چیز زمین پر گھسٹنے لگی۔ شیطان کی خالہ صہبا دل ہی دل میں ہنستی ہوئی اجنبی کو دیکھتی رہی

اجنبی کو بڑا طیش آیا، اُس نے وہی پُرانی جوتی اُٹھائی اور بولا "جی تو چاہتا ہے کہ اتنی جُوتیاں ماروں کہ تمہارے سر کا بھُرتہ بنادوں مگر مجبور ہوں مجھے اسلم صاحب کا گھر معلوم کرنا ہے۔ توبہ تم جیسے شریروں سے خدا بچائے
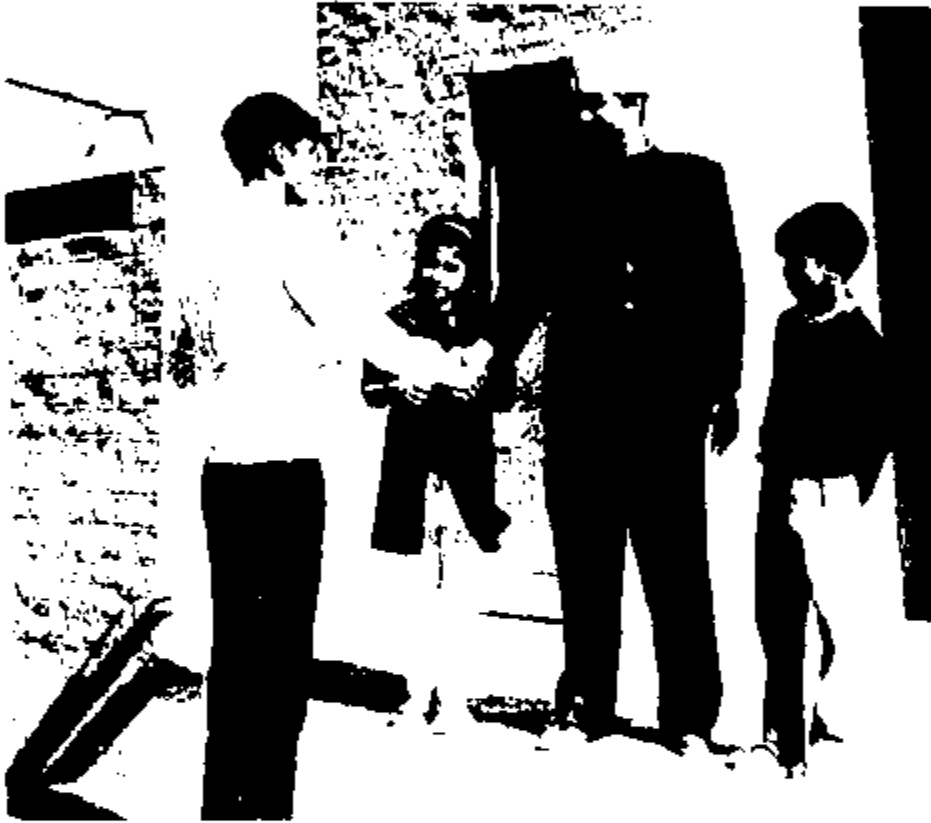
اب کے صہبا اور جنید نے سوچا کہ لاؤ اسلم بھیا سے ملوا ہی دیا جائے۔ کیوں کہ اسلم صاحب اُن کے ابا تھے۔ وہ اجنبی کو اپنے ساتھ لے کر گھر آئے اور ابا سے ملوایا

مگر کاش انہیں معلوم ہوتا کہ یہ اجنبی تو ان کے نئے ماسٹر جی تھے! اور کبھی ان نئے ماسٹر جی نے پہلے ہی دن اُس مذاق کا بدلہ لے لیا۔
صہبا اور جنید مُرغا بنے کھڑے رہے اور ماسٹر جی کی بیدیں اُن پر برستی رہیں! ●●

کولگیٹ سے سانس کی بدبُو کو ختم کیجئے
اور ساتھ ہی ساتھ دن بھر کے لئے دانتوں کی سڑن کو روکیے

کیونکہ کولگیٹ ڈینٹل کریم سے ایک ہی بار برش کرنے سے ۸۵ فیصدی تک مُنہ میں بدبُو اور دانتوں میں سڑن پیدا کرنیوالے جراثیم دُور ہو جاتے ہیں

سائنسی تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ کولگیٹ ۱۰ میں سے ۷ کی حالتوں میں سانس کی بدبُو کو فوراً ختم کر دیتی ہے۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد کولگیٹ ڈھنگ سے برش کرنے پر دانتوں کی سڑن جاتی رہتی ہے۔ یہ عمل زیادہ لوگوں کے لئے زیادہ کارگر ثابت ہوا ہے۔

اس کامیابی کی مثال دانتوں کے منجن کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی صرف کولگیٹ یہ ثبوت مہیا کرتا ہے۔

بچے آسانی کے ساتھ کولگیٹ سے برش کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ کیونکہ اسکی زیادہ دیر تک قائم رہنے والی پیپرمنٹ جیسی خوشبو انہیں بہت پسند آتی ہے۔

اگر آپکو پاؤڈر زیادہ پسند ہو تو یہ تمام فائدے کولگیٹ ٹوتھ پاؤڈر سے حاصل کیجئے... ایک ڈبہ مہینوں چلتا ہے

زیادہ صاف وتر و تازہ سانس اور زیادہ سفید دانتوں کے لئے دُنیا بھر میں زیادہ تر لوگ کسی دوسری ڈینٹل کریم کی نسبت کولگیٹ ہی خریدتے ہیں۔

DC.G.38 UR

چاند کی بُڑھیا

نفیس ادیبوی

سُنا ہے چاند ہے سونے کا انڈا
سُنا ہے چاند کا موسم ہے ٹھنڈا
سُنا ہے چاند میں ہیں خاک پتھر
سُنا ہے چاند میں ہیں لعل و گوہر
مگر وہ چاند کی بُڑھیا کہاں ہے؟

سُنا ہے چاند کے لب سُرخ سُنہرے
سُنا ہے چاند میں ہیں غار گہرے
سُنا ہے چاند میں چاندی کے دریا
بہت سُندر، بہت انمول بُڑھیا
مگر وہ چاند کی بُڑھیا کہاں ہے؟

سُنا ہے چاند ہے ماموں ہمارا
ہمیشہ "چندا ماموں" ہی پُکارا
خلاء میں پیت سے پالا ہوا ہے
زمیں کی گود کا پالا ہوا ہے
مگر وہ چاند کی بُڑھیا کہاں ہے؟

وہ دن وہ رات وہ سُورج وہ تارے
وہ ٹیلے، وادیاں، دریا، کنارے
ندی وہ نُور کی کِرنوں کی نیّا
سُنا ہے چاند میں سب کچھ ہے بھیّا
مگر وہ چاند کی بُڑھیا کہاں ہے؟

جانوروں کے رنگ ڈھنگ

رام چڑیا اپنا گھونسلا کیسے بناتی ہے؟

اُن مچھلیوں کی ہڈیوں سے جنہیں وہ کھا چکی ہوتی ہے۔ رام چڑیا تعمیر کے فن میں
ماہر ہوتی ہے اور اپنا گھونسلا خوب مضبوط اور آرام دہ بنا لیتی ہے۔

خرگوش کا خطرے کا سگنل کیا ہے؟

اس کی سفید دُم۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی خرگوش تیر کی طرح
اپنے گھر کا رُخ کرتا ہے اور اپنی دُم کو آخری بار کھینچ کر چھپ جاتا ہے۔ آس پاس کے
خرگوش یہ اشارہ پاتے ہی اسی کی طرح غائب ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس طرح
میاں خرگوش کو گھاٹا بھی ہوتا ہے۔ گھات میں رہنے والے
شکاری کو اس کی موجودگی کا پتہ
چل جاتا ہے، جب کہ اگر وہ نہ ہلتا جُلتا تو شاید شکاری کی نظر سے اوجھل رہتا۔

بڑے جب تمہیں ڈراتے ہیں کہ "یہ گینڈا تمہیں کھا جائے گا" تو کیا وہ ٹھیک کہتے ہیں؟

نہیں ـــــ میاں گینڈے سبزی خور ہیں۔ گوشت کبھی نہیں
کھاتے۔ نرسل اور موٹی گھاس ان کا دل پسند کھاجا ہیں، پھر بھی اگر تم چڑیا گھر
جاؤ تو ان سے دُور کی ہی صاحب سلامت رکھنا

بچوں کے کھیل

م۔ک۔مہتاب

بچے جب مل بیٹھتے ہیں تو کوئی نہ کوئی کھیل ضرور
شروع ہو جاتا ہے۔ خواہ کوئی ملک ہو یا کوئی موسم، بچوں کو
کھیلنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ کچھ کھیل ایسے ہوتے ہیں جو
کمروں میں کھیلے جاتے ہیں اور کچھ میدانی کھیل ہوتے ہیں۔
آپ بھی بہت سے کھیل کھیلے ہوں گے۔ آپ کی تفریح کے
لئے کچھ اور کھیل بتائے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آپ
کے لئے بالکل نئے ہوں۔ ایسی صورت میں آپ اور آپ
کے ساتھی بہت لطف اندوز ہوں گے۔

اندھا مداری

یہ کھیل بہت دلچسپ اور آسان ہے۔ گھر کے اندر یا
باہر کھیلا جا سکتا ہے۔ یورپ میں بچے اس کھیل کو بہت شوق
سے کھیلتے ہیں۔

اس کھیل میں ایک بچے کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی
جاتی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھما دیا جاتا ہے،
جسے مداری کا ڈنڈا کہا جاتا ہے۔ باقی سب بچے انگلیاں پکڑ
کر مداری کے گرد حلقہ بنا کر ناچتے ہیں اور کوئی سا گیت گاتے
ہیں۔ مداری اپنا ڈنڈا کسی بچے کی طرف کرتا ہے تو وہ بچہ
حلقے کے اندر آ کر ڈنڈے کا دوسرا سرا تھام لیتا ہے۔ اب
مداری مونہہ سے تین بار بکری کے ممیانے، بلی کے میاؤں

میاؤں کرنے یا کتے کے بھونکنے کی آواز نکالتا ہے، ڈنڈے کے دوسرے سرے پر لڑکا اس آواز کی نقل اتارتا ہے اور مداری اندازہ لگاتا ہے کہ دوسری طرف کون لڑکا ہے۔ اگر اس کا اندازہ ٹھیک ہو تو مداری حلقے میں چلا جاتا ہے اور دوسرا لڑکا مداری بن جاتا ہے۔ نہیں تو بچے پھر حلقے میں ناچنے اور گانے لگتے ہیں اور مداری پھر کسی بچے کو بلاتا ہے۔ ہر بار مداری مختلف جانوروں کی آوازیں نکالتا ہے۔ ایک بات کا دھیان رکھیں کہ ڈنڈا زیادہ لمبا یا نوکیلا نہ ہو کیوں کہ مداری کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور یہ ڈنڈا کسی کے مونہہ یا آنکھ پر لگ سکتا ہے۔

اندھیرے میں مچھلی پکڑنا

یہ کھیل چین میں بہت کھیلا جاتا ہے۔ ہر بچہ اپنا نام کسی مچھلی کے نام پر رکھ لیتا ہے۔ اب ایک کھلاڑی کو مچھیرا چن لیا جاتا ہے اور اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔

مچھیرا ایک ہی جگہ پر کھڑا رہتا ہے۔ اُس کے گرد اندھیرا سمندر ہے، جس میں مختلف ناموں کی مچھلیاں تیر رہی ہیں مچھیرا کھڑا ہے۔ مچھلیاں آتی ہیں اور اُسے چھو کر نکل جاتی ہیں۔ مچھیرا انھیں پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی مچھلی اُس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اُس کا نام پکارتا ہے۔ اگر مچھلی کہتی ہے 'غلط' تو وہ اُسے چھوڑ دیتا ہے اور پھر اندھیرے میں ٹٹولنے لگتا ہے اگر مچھلی ٹھیک پکڑی جائے تو مچھلی پٹی باندھ کر مچھیرا بن جاتی ہے اور مچھیرا مچھلی بن کر اندھیرے سمندر میں تیرنے لگتا ہے۔

سوم منگل

یہ میدانی کھیل گیند سے کھیلا جاتا ہے اور بچوں میں بہت چستی پیدا کرتا ہے۔ اس کھیل کے لئے کم از کم سات بچے ہونے چاہئیں۔ اگر بچے سات سے زیادہ ہوں تو کھیل کا نام سوم منگل کی بجائے جنوری فروری ہو جاتا ہے۔ کھیلنے والے بچوں کو اگر وہ سات ہوں تو ہفتے کے سات دنوں کے نام دئے دیئے جاتے ہیں۔ اگر سات سے زیادہ ہوں تو مہینوں کے نام دے دیئے جاتے ہیں۔ اب سوم ایک نرم ربڑ کی گیند لے کر اسے سامنے کی دیوار پر پھینکتا ہے اور باقی بچے اس کے گرد گیند کو پکڑنے کے لئے تیار کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن دیوار سے ٹکرا کر آنے والی گیند صرف وہی بچہ دبوچے گا جس کا نام سوم گیند پھینکتے وقت پکارے گا۔ جس لڑکے کا نام لیا گیا ہے اگر وہ گیند کو پکڑ لیتا ہے تو وہ کسی اور لڑکے کا نام لے کر گیند کو دیوار سے ٹکرائے گا۔ اگر وہ گیند نہیں پکڑ سکا تو سوم ہی گیند کو پکڑ کر باقی لڑکوں میں اسے، جو اب سب بھاگ گئے ہوں گے، کسی ایک کو گیند کا نشانہ بنانے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ کسی کو نشانہ بنا لیتا ہے تو سب لڑکے واپس آجائیں گے اور پھر سوم کسی لڑکے کا نام پکار کر گیند دیوار پر مارے گا۔ لیکن اگر وہ نشانہ نہیں لگا سکا تو وہ گیند چھوڑ دے گا اور منگل گیند سے کھیل شروع کرے گا۔ جو بچہ تین بار گیند کا نشانہ بن جائے وہ آؤٹ سمجھا جائے گا۔

مسکراہٹ

یہ انتہائی پرلطف کھیل جرمنی کے بچوں میں بہت مقبول ہے۔ اس سے اجنبی بچے بھی بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ اس کھیل میں سب بچے ایک دائرے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یا بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ سب نہایت سنجیدہ اور گمبھیر شکلیں بنا لیتے ہیں۔ اب ایک کھلاڑی مسکرانا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے مونہہ پر ہاتھ پھیر کر مسکراہٹ اُتارتا ہے اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کسی کھلاڑی کے مونہہ پر دے مارتا ہے۔ وہ خود سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اب جس بچے پر مسکراہٹ پھینکی گئی ہے اُس کا فرض ہے کہ وہ مسکرانے لگے اور کچھ دیر بعد چہرے سے مسکراہٹ اتار کر کسی اور بچے کی طرف پھینک دے۔ اور یہ سلسلہ اُس وقت تک چلتا ہے جب

تک صرف ایک کھلاڑی باقی رہ جائے۔ اس کھیل کا ضروری اصول یہ ہے کہ صرف وہی کھلاڑی مسکرائے جس کی طرف مسکراہٹ پھینکی جائے۔ اگر کوئی اور کھلاڑی ہنسے یا مسکرائے گا تو اُسے دائرے سے خارج کر دیا جائے گا۔ اس میں بچّوں کے لئے ہنسی ضبط کرنا اور اُسی دم سنجیدہ ہوجانا بہت مشکل بات ہے اور دیکھنے والے بھی اِس کھیل سے خوب لطف اٹھاتے ہیں۔

ہنسی کا کھیل

اس کھیل میں کمرے کے درمیان ایک پردہ لٹکا دیا جاتا ہے۔ بچّے دو برابر کی ٹولیاں بنا لیتے ہیں۔ ایک ٹولی پردے کے ایک طرف اور دوسری پردے کے دوسری طرف کھڑی ہوجاتی ہے۔ ایک ٹولی کا ہر کھلاڑی باری باری زور سے ہنستا ہے۔ اگر پردے کے دوسری طرف کے بچّے اس کو پہچان لیں تو وہ بچّہ بھی اُن کی طرف چلا جاتا ہے، نہ پہچان سکیں تو اُس سے اگلا بچّہ ہنستا ہے۔ اس طرح ایک ٹولی ہنستی اور دوسری پہچانتی ہے۔ بچّے مصنوعی ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹولیوں کے بچّے اِس طرح کم اور بڑھتے رہتے ہیں جو ٹولی دوسری طرف کے سب بچّوں کو ساتھ ملالے وہ جیت جاتی ہے اس کھیل میں بچّے ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح پہچان جاتے ہیں۔ اس کھیل کا نام ہے "کون ہنسا؟"

چوہا بلی

یہ ایک آسان اور پُر لطف کھیل ہے جسے چھوٹے بچّے بڑی دل چسپی سے کھیلتے ہیں۔ اِس کھیل میں بچّے دو برابر کی ٹولیوں میں بٹ کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ بیچ میں کافی جگہ کھلی رہ جاتی ہے۔ اب دونوں ٹولیوں میں سے ایک ایک بچّہ بیچ میں آجاتا ہے۔ دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ ایک بچّہ چوہا ہوتا ہے اور دوسرا بلی۔ بلی ایک سرے سے اور چوہا دوسرے سرے سے چلتا ہے۔ بلی کا کام چوہے کو پکڑنا ہے دونوں ٹولیاں اپنے ساتھی کو بتاتی جاتی ہیں کہ وہ داہنی طرف ہوجائے، آگے ہوجائے یا بائیں طرف ہوجائے، تاکہ وہ بلی کے ہاتھ سے بچ سکے اور بلی اُسے پکڑ نہ سکے۔ خوب جوش و خروش کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اگر بلی چوہے کو پکڑ لے تو مخالف پارٹی کا ایک رکن کم ہوجاتا ہے اور وہ ایک اور چوہا پیش کرتی ہے۔ اگر بلی ہار جائے تو جیتنے والی پارٹی بلی اور ہارنے والی پارٹی چوہا بھیجتی ہے۔ اِس طرح یہ دل چسپ کھیل کافی دیر تک چلتا ہے۔

ریچھ آیا

یہ اسکاٹ لینڈ کا ایک دل چسپ کھیل ہے جسے کھلے میدان یا مکان میں کھیلا جاتا ہے جہاں چھپنے کے لئے کافی جگہ ہو۔ اِس کھیل میں ایک بچّے کو ریچھ بنایا جاتا ہے۔ اُسے کہیں چھپ جانے کی اجازت ہے۔ باقی بچّے اُس کی طرف نہیں دیکھتے۔ پچاس یا سو تک گنتی کے بعد سب بچّے اپنے گھر سے ریچھ کو تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ جو بچّہ پہلے کہیں ریچھ کو دیکھ لیتا ہے وہ شور مچا دیتا ہے "ریچھ آیا، ریچھ آیا" اور سب بچّے گھر کی طرف بھاگتے ہیں۔ ریچھ اُن کا پیچھا کرتا ہے۔ جو بچّہ گھر نہ لوٹ سکے اور پکڑا جائے وہ بھی ریچھ بن جاتا ہے۔ اب دو ریچھ چھپنے جاتے ہیں اور باقی بچّے انھیں تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح ریچھوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ کئی بار صرف ایک بچّہ ہی تلاش کرنے والا رہ جاتا ہے اور سب ریچھ اُسے گھیر لیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ سب ریچھ ہی پیچھا کرنے کے لئے نکلیں۔ اگر تھوڑے بچّے رہ جائیں تو ریچھ بھی تھوڑے ہی باہر نکلتے ہیں جب کوئی بچّہ نہ رہے تو سب ریچھ اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکلتے ہیں اور کھیل دوبارہ شروع ہوجاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ بچّے ایک ہی بار میں تھک نہ گئے ہوں، کیوں کہ اس کھیل میں بہت ورزش ہوتی ہے اور بچّے اتنے تھک جاتے ہیں کہ ان میں "ریچھ آیا، ریچھ آیا" کی آوازیں لگانے کا دم بھی باقی نہیں رہتا۔

پریم وار برٹنی
دکّی
د
دِل جواں ہے تو راہِ قیمت میں
کامیابی ہی کامیابی ہے
کامیابی کے ہر خزانے کی
سچی محنت ہی ایک چابی ہے
تکّی
ت
تازگی روشنی شباب گلاب
یوں تو ہر شے جہاں کی گود میں ہے
کسی جنت میں بھی نہیں لیکن
وہ جو تسکین ماں کی گود میں ہے
نیا تاش
یکّا
یہ
یہ ہے انسانیت کا پہلا اصول
آدمی آدمی سے پیار کرے
اور پھر دوجہاں کے خالق کو
جھک کے سجدہ ہزار بار کرے
چوکی
چ
چار اچھے اصول جینے کے
فرض، ہمت، خلوص، سچائی
جس نے ان پر عمل کیا اُس نے
زندگی سے شکست کب کھائی
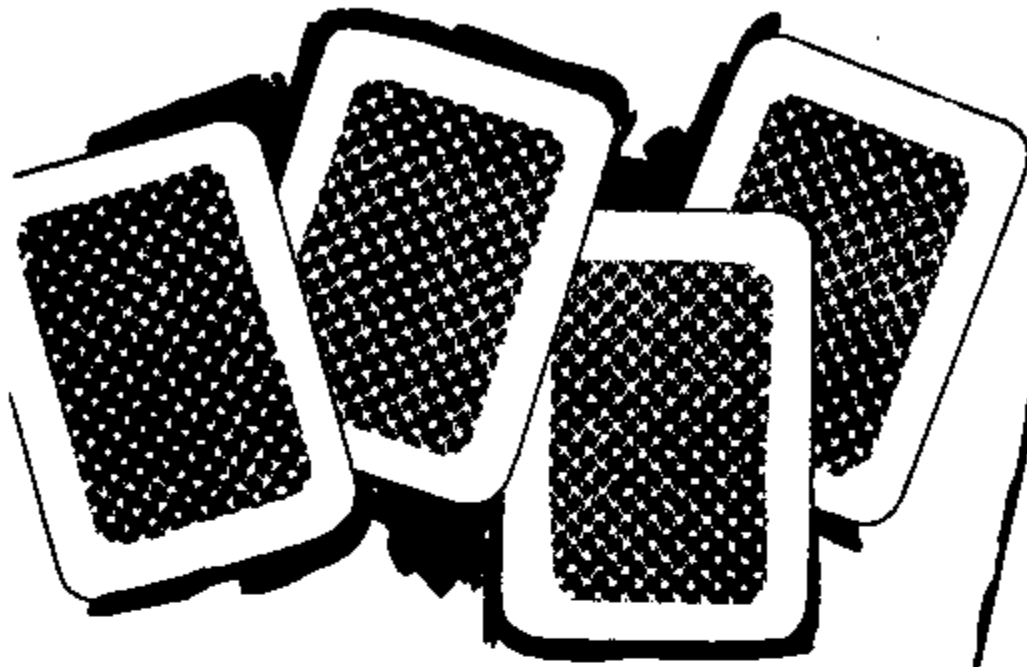
پنجی
پ
پیار سچا ہو زندگی سے اگر
دکھ کی دلدل میں پھول کھلتا ہے
کوششیں رائیگاں نہیں جاتیں
صبر کا پھل ضرور ملتا ہے
اکّی
ا
اپنے ہاتھوں کیا خود اپنا کام
اس سے روشن ہوا ہمارا نام
درحقیقت اسی کو کہتے ہیں
آم کے آم گٹھلیوں کے دام
چھکّی
چھ
چھپتے سورج سے پوچھ لو بے شک
بہتے دریا کبھی نہیں رکتے
کچھ بھی ہو جائے ظلم کے آگے
نیک بندوں کے سر نہیں جھکتے
نہلا
ن
نہرو گاندھی سبھاش کی دھرتی
ہم سے بھی مانگتی ہے قربانی
آؤ سب دیں لہو کا نذرانہ
تاکہ بڑھ جائے اس کی تابانی
سَتّی
س
ساتھ چلتا ہے آسماں جن کے
ہم تو اُن منزلوں کے راہی ہیں
کوئی ہندو نہیں مسلمان نہیں
سب کے سب دیش کے سپاہی ہیں

بادشاہ
ب
بڑھ گیا اور بھی جلال اُس کا
لشکرِ وقت رُک سکا نہ کبھی
جھک گئے سات آسمان مگر
سر ہمالہ کا جھک سکا نہ کبھی
دہلا
د
دوستی شہد کی طرح شیریں
دشمنی زہر کا پیالا ہے
رونے والے بھلا یہ کیا جانیں
زندگی موتیوں کی مالا ہے
غلام
غ
غیر کے ہم غلام تھے کل تک
کل کبھی کا تھا آج اپنا ہے
رقص کر اب تو دورِ آزادی
ملک اپنا ہے راج اپنا ہے
جوکر
ج
جان تو جان موت نے بھی ہمیں
داد دی بڑھ کے اِس جسارت کی
دار پہ چڑھ کے جب کہا ہم نے
جے ہو ماتا کی جے ہو بھارت کی
بیگم
ب
بے غرض زندگی کے متوالے
جس کے سائے میں مست رہتے ہیں
اُس کلا کے جہان مندر کو
لوگ "ہندوستان" کہتے ہیں

سراج انور (چوتھی قسط)

نواب فیروز کا داماد امجد اور اس کی لڑکی نجمہ آسٹریلیا کے لئے روانہ ہونے والے تھے۔ فیروز ہوائی اڈّے پر ان کا انتظار کرتا رہا مگر وہ دونوں وہاں نہیں پہنچے۔ فیروز نے محل میں آکر معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ امجد کی کار سڑک پر سے اپنے آپ ہی غائب ہوگئی۔ خیال تھا کہ انہیں اغوا کیا گیا ہے۔ اُسی دن پورے شہر کی بجلی بھی چلی گئی اور بجلی کے چلے جانے سے بڑے حادثے ہوئے اور پھر فیروز کے کمرے میں ایک سبز رنگ کا دُھواں داخل ہوا اور اس دُھوئیں نے جکاری اور زوک کی شکل اختیار کرلی۔ جکاری کی آنکھ سے ایک روشنی نکلی اور پھر کسی نے کہا کہ فیروز کو اس کے کیے کی سزا ملے گی۔ اُس نے چونکہ سیارہ زہرہ کے لیڈر جیگا کو ختم کردیا ہے اس لئے اب زہرہ والے اُس سے انتقام لیں گے۔ یہ انتقام انہوں نے اس طرح لیا کہ دُنیا کے معمولی جانور بڑے ہوگئے۔ کمرے کی مکھیاں اور چھپکلیاں بہت بڑی ہوگئیں۔ فیروز کی بیوی زرینہ کے پیچھے اُس کی پالتو بلی شیرنی جتنی بڑی ہوکر دوڑنے لگی۔ اختر کی طرف ایک چھپکلی مگرمچھ جتنی بڑی ہوکر لپکنے کی کوشش کر رہی تھی!

ایک ـــ دو ـــ تین

اُس کی زرد آنکھوں میں انسانوں کے خلاف نفرت صاف صاف نظر آ تی تھی۔ بار بار وہ اپنی پتلی سی زبان باہر نکالتی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اندر کرلیتی۔ اس کی لمبی دُم بے قراری سے ہل رہی تھی۔ بالکل وہی سماں تھا جو ہم سب ایک بار پاتال میں ایک دیوزاد گرگٹ کے حملے کے وقت دیکھ چکے تھے۔ (ناول "کالی دنیا" پڑھیے)۔ اُس وقت تو امجد کی بہادری کی وجہ سے ہماری جان بچ گئی تھی۔ مگر اس وقت صرف خدا کی ہی ذات تھی جو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتی تھی۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، اختر بھی اب نو عمر لڑکا نہیں رہا تھا، بلکہ اب اُس کا قد اچھا خاصا بڑھ چکا تھا۔ اس میں اتنی طاقت ضرور تھی کہ مصیبت کے وقت اپنی حفاظت خود کر سکے۔ چھپکلی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گیا، لیکن پھر اچانک خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں اور زرینہ دروازے کے قریب کھڑے تھے اور سوامی اختر کی مدد کے خیال سے لپک کر اس کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔ سوامی میرے بچوں کو کس قدر چاہتا تھا، اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب سوامی نے اختر کو کندھے سے پکڑ کر اپنے پیچھے کرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

اختر نے اپنے کندھے جھٹک کر سوامی کو پیچھے دھکیل دیا اور پھر جلدی سے برابر ہی رکھی ہوئی ایک کرسی اُٹھالی۔ بس یہ لکڑی کی کرسی ہی وہ ہتھیار تھا جس کے بھروسے پر اختر اس دیوزاد چھپکلی سے ٹکر لینے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ چھپکلی نے اب اپنے مقام سے ایک جست لگائی تھی۔ اس کے جست لگاتے ہی زرینہ زور کی ایک چیخ مار کر اختر کو بچانے کی خاطر اس کی طرف لپکی۔ لیکن میں نے فوراً اُسے پیچھے گھسیٹ لیا۔

شاید آپ لوگ مجھے بزدل سمجھیں گے کہ میں اپنے عزیز بیٹے کو موت کے مونہہ میں جاتے دیکھتا رہا اور خطرناک گھڑی میں اپنی بیوی کو سہارا دئے کھڑا رہا۔ لیکن درحقیقت یہ بات نہیں ہے۔ میں خطروں کی چکی میں پس کر اب کندن بن چکا تھا۔ بہت کچھ کھو کر میں نے ایک چیز حاصل کی تھی۔ اور وہ چیز تھی اوسان! میں جانتا تھا کہ ایسے موقعوں پر اوسان کتنے کام آتے ہیں۔ آدمی سے ذرا بھی چوک ہوجائے تو وہ نقصان اُٹھا سکتا ہے۔ اس لئے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اوسان کھونے سے بہتر یہی ہے کہ اختر اور سوامی کو اکیلے اس بلا کا مقابلہ کرنے دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اس عرصے میں مجھے کوئی طریقہ سُوجھ جائے اور میں ان دونوں کی مدد کر سکوں۔

چھپکلی ہوا میں چھلانگ لگا کر اختر کے اوپر آئی اور اختر نے کرسی کی ڈھال بنا کر اسے روکا۔ چھپکلی فرش پر گرتے ہی پھر سنبھلی اور اِس بار اس نے اُچھل کر اختر کی ٹانگ مونہہ میں دبانے کی کوشش کی۔ مگر اختر چونکہ پہلے ہی سے ہوشیار تھا، اس لئے اُس نے جلدی سے اپنی ٹانگ پیچھے کھینچ لی اور پھر فوراً ہی کرسی چھپکلی پر دے ماری۔ لیکن شاید ہماری قسمت خراب تھی، کرسی چھپکلی کی کمر پر گرنے کی بجائے پختہ فرش پر گری، کیوں کہ اتنے سے وقفے میں چھپکلی کروٹ لے کر کرسی کی زد سے باہر نکل چکی تھی۔

مکھیوں کی تیز اور گونجتی ہوئی بھنبھناہٹ اب ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ ویسے بھی عام حالات میں ہم ننھی سی مکھی کا وجود اپنے جسم پر برداشت نہیں کرتے اور جب بھی کوئی مکھی ہمارے جسم کے کسی حصے پر بیٹھتی ہے تو ہم اُسے فوراً اُڑانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس وقت کمرہ جن مکھیوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا، وہ کوئی معمولی مکھیاں نہیں تھیں بلکہ بڑھتے بڑھتے وہ اب مُرغی کے انڈے سے بھی بڑی ہوچکی تھیں۔ اور ستم یہ تھا کہ یہ مکھیاں بھی اب ہم پر حملہ کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک مکھی نے جب زرینہ کے مونہہ پر بیٹھنے کی کوشش کی تو خوف زدہ ہو اُس نے جلدی سے دروازے پر پڑے ہوئے پردے سے اپنا مونہہ چھپا لیا۔ مکھی نے اپنے شکار کو بھاگتے

دیکھ کر رُخ پلٹ لیا اور میری طرف متوجہ ہوئی۔ جیسے ہی وہ بھن بھن کرتی ہوئی میرے قریب آئی میں نے صوفے پر پڑا ہوا گدا اُٹھا لیا اور تاک کر اُسے مارا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ مکھی دیوار سے جا کر ٹکرائی اور فوراً مر گئی ——

لیکن کمرے میں صرف ایک ہی مکھی تو نہیں تھی۔ اور بھی بہت سی مکھیاں اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ مکھیوں سے نمٹنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، میں اختر کی طرف متوجہ ہوا۔ ساتھ ہی میں نے زرینہ کو ہدایت کی کہ وہ اسی طرح پردے میں لپٹی رہے۔ دروازے پر خوف ناک بلّی کی غرّاہٹ اور کھسیا کر دروازہ نوچنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ ہی بلّی دروازے کو بار بار دھکا بھی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دروازہ اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا! زرینہ اِن آوازوں کو سُن کر سہم گئی تھی اور بدستور پردے کے اندر لپٹی ہوئی تھی۔

چھپکلی ابھی تک اپنی خوف ناک زبان نکال کر بار بار اختر کو عجیب انداز سے دیکھ رہی تھی۔ سوامی نے بھی اختر کی دیکھا دیکھی ایک کُرسی اُٹھالی تھی اور موقع دیکھ رہا تھا کہ کب چھپکلی اس کی زد میں آتی ہے۔ چھپکلی تو اس کی زد میں جب آتی تب آتی، اتفاقاً میں ہی ایک دوسری چھپکلی کی زد میں آچکا تھا۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور چھت پر سے ایک منحوس چھپکلی اچانک میرے اوپر کود گئی۔ جیسے ہی ایک بوجھ سا مجھ پر آیا، میں نے گھبرا کر اپنے کندھے جھٹکے اور بے اختیار اپنے ہاتھوں سے اُس بھیانک عفریت کو اُٹھا کر دُور پھینک دیا۔ تیرے خدا کتنی بدبُو تھی اُس میں اور کس قدر گھناؤنی تھی وہ۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ کمرے کی تینوں چھپکلیاں اب ہماری دشمن بن چکی ہیں اور شاید انہوں نے سازش کر کے ایک ساتھ حملہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے، کیوں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اب وہ تینوں ایک مقام پر جمع ہو چکی ہیں اور اپنی لمبی لمبی زبانیں ایک دوسرے کی طرف بڑھا کر یہ مشورہ کر رہی ہیں کہ حملہ کس طرح کیا جائے؟ ہم سب کے لئے یہ صورتِ حال بہت نازک تھی۔ میری عقل حیران تھی کہ کیا کروں۔ اگر مجھے علم ہوتا تو اپنی رائفل ہی اپنے کمرے میں لے لیتا آتا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ ایسا وقت آنے والا ہے جب مجھے مگرمچھ سے بھی بڑی چھپکلیوں کا مقابلہ کرنا ہوگا اور میں اُن کے آگے خود کو بے بس ولاچار سمجھوں گا۔

ناچ رے بیٹا ناچ ——

زرینہ نے بھی شاید بزدلوں کی طرح خود کو پردے کے پیچھے چھپانا اچھا نہیں سمجھا۔ وہ میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ سوامی کے ہاتھ میں پہلے ایک ڈنڈا تھا جسے چھوڑ کر اس نے اختر کی طرح کُرسی ہاتھوں میں اُٹھا لی تھی۔ وہی ڈنڈا اب زرینہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خوف زدہ نظروں سے کبھی کمرے میں چاروں سمت گھومتی ہوئی مکھیوں کو دیکھنے لگتی اور کبھی چھپکلیوں کو۔ چھپکلیاں آہستہ آہستہ اپنے پنجے بڑھا رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے ایک زبردست جَست لگائی اور ہم پر ایک ساتھ حملہ آور ہوئیں۔ ہم تینوں ان بلاؤں کو اپنے جسم سے دُور پھینک دینے کی کوشش کرنے لگے اور بے چاری زرینہ باری باری ہر ایک چھپکلی کی کمر پر ڈنڈے بجانے لگی۔ ایسا مکروہ اور دَم گھونٹ دینے والا سانس اُن چھپکلیوں کے مونہہ سے نکل رہا تھا کہ میں کیا بتاؤں۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ جلد سے جلد اس منحوس بلا کو اپنے جسم سے علیحدہ کر دوں اور آخر کار میں اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر پھر یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی کہ ایک چھپکلی نے اختر کو زمین پر گرا لیا ہے اور اب وہ بھیانک جبڑوں میں اختر کے سر کو دبوچ لینے کی کوشش کر رہی ہے یہ دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ یقیناً وہ خدا کی مدد ہی تھی جس کے باعث میرے ذہن میں اچانک وہ خیال آیا جو بعد میں ہم سب کی جانیں بچانے کا باعث بنا۔

اختر کو اس حالت میں دیکھتے ہی دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر اوپر دیکھا کہ کہیں بجلی پھر تو نہیں چلی گئی۔ بجلی کا لفظ ذہن میں آنا تھا کہ یکایک مجھے ایک ترکیب سُوجھ گئی۔ کرنے

میں ایک بڑا میبل لیمپ رکھا تھا۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر لیمپ سے تار نوچ لیا۔ بڑی تیزی کے ساتھ دانتوں سے اس کے دونوں تار چھیلے اور تار کے دونوں سروں کو الگ الگ کر کے دیوار میں لگا ہوا سوئچ کھول دیا۔ اب تار کے ننگے سروں پر کرنٹ موجود تھا۔

میں نے بڑی پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر یہ دونوں ننگے تار چھپکلی کی کمر سے لگا دئے۔ ۲۲۰ وولٹ کا ایک زبردست جھٹکا اُسے لگا اور اس نے گھبرا کر اختر کو چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک کریہہ آواز اس کے مونہہ سے نکلی اور پھر وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ اپنی ایک ساتھی کا حشر دیکھ کر باقی دونوں چھپکلیوں نے اپنے بدہیبت پنجے سوامی کی گردن میں گڑو نے شروع کر دئے۔ میں نے بجلی کے ننگے تار سے اُن دونوں کی تواضع کرنی بھی ضروری سمجھی اور پھر اُن کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی چھپکلی کا ہوا تھا۔

اختر نے خوشی کا نعرہ لگایا اور زرینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں اب سوامی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اپنی گردن دبا رہا تھا۔ چھپکلی کے نوکیلے پنجوں نے اُس کی گردن کو نوچ لیا تھا اور کئی جگہ سے خون رس رہا تھا میں نے اپنے رومال سے اس کا یہ خون پونچھا اور پھر اختر سے کہا " مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایسا ہی ایک بہت لمبا تار ہال کے دوسرے کونے میں رکھا ہے تم فوراً اُسے نکال کر کھول لو اور اس کے دونوں سرے چھیل لو۔ ہم اب اس کمرے سے باہر چلیں گے۔"

" مگر ابا جی، باہر تو قیامت آئی ہوئی ہوگی۔"

" تو پھر ہم کب تک یہاں بزدلوں کی طرح بیٹھے رہیں گے۔ محل میں اور بھی لوگ ہیں۔ نہ جانے ان کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ ہمیں اُن کی بھی مدد کرنی ہے۔"

" مالک ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا۔" سوامی نے گردن سے خون پونچھتے ہوئے کہا " اس بجلی کے ہتھیار سے ہم دیو زاد جانوروں کو روک سکتے ہیں۔ موقع ملتے ہی میں مالک کی رائفل لے آؤں گا، اور پھر جب تک دَم میں دَم ہے ان بلاؤں سے ٹکر لی جا سکتی ہے۔"

اختر نے اثبات میں گردن ہلائی اور پھر فوراً ہی تار نکال لایا۔ لمبے سے ڈنڈے کے ساتھ ہم نے یہ تار باندھ دیا اور اس کے دونوں سرے ننگے کر دئے۔ بورڈ سے تار لگانے کے بعد سوئچ آن کر کے میں نے یہ ڈنڈا اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور پھر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے سوامی سے کہا کہ وہ دروازہ کھول دے۔ زرینہ اور اختر میرے پیچھے تھے اور اختر نے احتیاطاً کرسی پھر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی بلّی نے غرّا کر اپنا سیدھا پنجہ مجھے پکڑنے کے لئے بڑھایا، مگر ایسا کرنے سے بجلی کے تار اُس کے پنجے سے چھو گئے۔ اس کے مونہہ سے بڑی بھیانک میاؤں کی آواز نکلی اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اُس وقت وہ معمولی سی پالتو بلّی گدھے کے برابر اونچی اور ببر شیر جتنی بڑی ہو گئی تھی۔ قد کے لحاظ سے اس کی آواز بھی بہت بڑی نکلی۔ اس نے دوبارہ حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر کرنٹ لگتے ہی اُچھل کر دُور ہٹ گئی۔ کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑی ہوئی گھورتی رہی اور پھر وہی زوردار میاؤں کی آواز نکال کر بھاگتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔

اب ہمیں کم از کم اتنا موقع مل چکا تھا کہ ہم باہر کے حالات کا جائزہ لے سکیں۔

یوں لگتا تھا گویا قیامت آگئی ہے۔ شہر کے ہر طرف سے زبردست شور اُٹھ رہا تھا۔ آسمان پر ہزاروں پرندے اُڑ رہے تھے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ پرندے بہت بڑے تھے۔ میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ مختلف پرندے ایک دوسرے پر جھپٹ بھی رہے تھے۔

ان پرندوں کے درمیان مجھے بمبار جہاز بھی نظر آئے جو اُن دیو زاد پرندوں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر کافی اطمینان ہوا۔ ہماری ہوائی فوج اب حرکت میں آ چکی تھی اور چُن چُن کر اُن پرندوں کو ختم کر رہی تھی جو انسانوں کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ عقاب اور شکرے جیسے جانوروں کو تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

آپ میری اس داستان کو آگے پڑھنے کے آرزومند ہوں گے لیکن میں فی الحال رُک رُک کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اُس وقت شہر کی کیا حالت تھی؟ یہ باتیں گو مجھے بعد میں معلوم ہوئیں لیکن میرے خیال میں مناسب یہی ہے کہ یہاں میں ان باتوں کو بیان کر دوں۔

شہر میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر جانور بھی بے حد خطرناک ہو چکے تھے۔ مچھر اور چیونٹیاں بڑھ کر مُرغی کے برابر ہو گئی تھیں، اور ان چیونٹیوں نے دُکانوں اور مکانوں

پر بول دیا تھا جنکر کے گودام منٹوں اور سیکنڈوں میں صاف ہو گئے تھے۔ پھڑوں کی سونڈ ایک لمبے سے خنجر کی طرح ہو گئی تو صاف نظر آتی تھی۔ پھڑوں کے ڈسنے سے بہت سے آدمی مر گئے اور چیونٹیوں کے کاٹنے سے لوگوں کے جسم سوج کر سرخ ہو گئے۔ سانپ بڑھتے بڑھتے اژدہے بن گئے تھے۔ جس چیز کو بھی یہ اژدہے اپنے شکنجے میں کس لیتے تھے، وہ فنا ہو جاتی تھی۔ چوہے، کتّے اور چڑیاں بھی خوں خوار بن گئی تھیں۔ کتّے بالکل شیر نظر آتے تھے۔ بھیڑیا بھی کیا خطرناک ہوگا جو یہ کتّے ہو گئے تھے۔ انہوں نے راہ چلتے آدمیوں کو مار ڈالا تھا اور لمبی لمبی زبانیں نکال کر وہ لگاتار اپنے شکار پر حملے کر رہے تھے۔

یہ حال تو چھوٹے جانوروں کا تھا، مگر بڑے جانوروں نے تو جیسے زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ گائے، بیل، گھوڑے، گدھے جیسے پالتو جانور اتنے اونچے ہو گئے تھے کہ ان کے قد اونچی اونچی عمارتوں سے بھی بڑھ گئے تھے۔ ان جانوروں کی صرف آواز سے ہی بہت سی عمارتیں گر پڑی تھیں اور جب انہوں نے دولتیاں جھاڑی تھیں تو ہزاروں مکانوں کو زمین کے برابر کر دیا تھا۔ گھوڑے عمارتوں کے اوپر سے جست لگا کر ادھر سے اُدھر چلے جاتے تھے اور جب وہ بھاگتے تو مکانوں کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی تھی۔

پورے شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔ فوج شہر میں گشت کر رہی تھی۔ جانوروں کا مقابلہ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے کیا جا رہا تھا۔ جہاں بھی کوئی قد آور جانور نظر آتا تھا، توپوں کے لپکتے ہوئے شعلے اُسے موت کی میٹھی نیند سُلا دیتے تھے۔

پورے ہندوستان کی یہی حالت تھی۔ کئی شہروں میں تو بروقت مدد بھی نہیں پہنچ سکی تھی اور چھوٹے موٹے شہر بالکل نیست و نابود ہو گئے تھے۔ فوج بہت سی جگہوں پر قابو پانے میں ناکام رہی۔ دریاؤں اور سمندر میں بھی افراتفری مچ گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں وھیل مچھلی کے برابر ہو گئی تھیں اور انہوں نے گودی میں کھڑے ہوئے جہازوں کو تباہ کر دیا تھا۔ غلّے سے لدے ہوئے کچھ جہاز باہر کے ملکوں سے ہندوستان آ رہے تھے۔ ان جہازوں کا پھر پتہ ہی نہ چل سکا اور اس طرح لاکھوں من غلّہ سمندر کے بھوکے پیٹ کی نذر ہو گیا۔ ٹیلی فون اور بجلی کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ جانوروں نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کو توڑ موڑ کر رکھ دیا

آج پھر تم دیر سے آئے ہو

تھا اور بجلی گھروں پر دھاوا بول کر ان کا نام و نشان مٹا دیا تھا۔ غرض ہندوستان کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ شاید کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ پولیس اور فوج نے ہر شہر کا نظام سنبھال لیا تھا۔ مگر بربادی کا طوفان تھا کہ بڑی تیزی سے بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا۔

اتنی باتیں بتانے کے بعد اب میں اپنی اس بھیانک کہانی کو پھر شروع کرتا ہوں۔

بجلی کا تار ہاتھ میں لئے ہوئے میں تو وہیں کھڑا رہا لیکن سوامی کو یہ ہدایت کی کہ وہ جلد سے جلد میرے کمرے میں سے رائفل نکال کر لائے۔ سوامی بھاگتا ہوا میری خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ مگر اس کے جاتے ہی ایک موٹے سے چوہے نے، جو اب بکری کے برابر ہو گیا تھا چھلانگ لگا کر زرینہ کی گردن دبوچ لی۔ زرینہ نے ایک بھیانک چیخ ماری اور وہ چوہے کے وزن سے دب کر زمین پر گر پڑی۔ میں نے اس کی چیخ سُن کر جلدی سے بجلی کا ننگا تار چوہے کے بدن سے لگا دیا اور پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو چھپکلیوں اور بلّی کا ہو چکا تھا۔

آسمان توپ کے گولوں اور شعلوں کے دُھوئیں سے کالا ہو گیا تھا۔ سوُرج کی روشنی بڑی مدھم ہو گئی تھی۔ پورے شہر سے آہ و بُکا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں یہ اندازہ اچھی طرح لگا چکا تھا کہ جس طرح میں اپنے محل کے اندر ان جانوروں سے لڑ رہا ہوں۔ اسی طرح شہر کے دوسرے لوگ بھی اپنی جانیں بچانے میں مصروف ہوں گے۔ ایسے وقت میں اپنی مدد آپ والی کہاوت پر عمل ہو رہا ہوگا۔ یہ جو معمولی سی چیلیں آسمان پر اُڑا کرتی ہیں، اب اپنی جسامت سے پچاس گنا بڑی

ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہاتھیوں کے پر لگ گئے ہوں اور وہ آسمان پر اُڑنے لگے ہوں۔

زرینہ اور اختر میرے پیچھے کھڑے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں پھر کوئی اچانک حملہ نہ ہو جائے۔ سچ پوچھئے تو میری بھی یہی حالت تھی۔ بجلی کا تار ہاتھ میں لئے ہوئے میں بھی دیوانوں کی طرح دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں، یا شاید نہ بتایا ہو تو اب بتائے دیتا ہوں، میرا محل ایک اونچے مقام پر تھا اور اس کی پشت پر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ دائیں طرف پام کے قدآور درختوں کے جھنڈ تھے اور بائیں طرف کھلا ہوا میدان، جس میں ایک خوب صورت بل کھاتی ہوئی سڑک شہر کی سمت جا رہی تھی۔ اس لحاظ سے میرے پاس کسی بھی مدد کا پہنچنا بہت مشکل تھا۔ مدد کے لئے اگر کوئی آنا بھی چاہتا تو شہر سے محل تک آتے آتے بھی اُسے ایک گھنٹہ لگتا۔ میں اس لئے بھی ڈر رہا تھا کہ بے دست و پا والی حالت میں کیا کر سکوں گا۔ بہر حال میں کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آسمان پر اُڑتی ہوئی دیوزاد چیلیں میرے محل کے اوپر منڈلا رہی ہیں۔ شاید ان کا ارادہ محل کے میدان میں کھڑے ہوئے لوگوں پر حملہ کرنے کا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں سوچ رہا تھا کہ اگر ان دیوزاد چیلوں نے ہم پر حملہ کر دیا تو اس اچانک حملے سے بچنے کے لئے میرے پاس کوئی طریقہ ہی نہ تھا۔

سوامی رائفل ہاتھ میں لئے ہوئے بھاگتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ اُسے دیکھ کر میری باچھیں کھِل گئیں۔ مگر پھر اچانک ہی یہ خوشی خاک میں مل گئی، کیوں کہ میں نے دیکھا کہ یکایک ایک بہت بڑی چیل نے تیر کی طرح نیچے اُتر کر سوامی پر حملہ کیا۔ سوامی نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے رائفل والے ہاتھ اونچے کر دئے۔ چیل نے رائفل کو شاید ایک معمولی سا تنکا سمجھا اور اسے اپنے پنجوں میں دبوچ کر واپس آسمان کی سمت پرواز کر گئی۔ سوامی صرف دیوانوں کی طرح ہاتھ ہلا کر رہ گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ اختر نے ایک چیخ ماری۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا کچھوا — گائے سے بھی بڑا کچھوا — اختر کی ٹانگ اپنے مونہہ سے پکڑ کر اُسے سمندر کی طرف گھسیٹ رہا ہے اور ویسا ہی ایک دوسرا کچھوا زرینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے بجلی کا ننگا تار اس کچھوے کی کمر سے لگا دیا جو اختر کو گھسیٹ رہا تھا مگر اِس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ میں نے پاگلوں کی طرح اس کی کمر پر ڈنڈا بجانا شروع کر دیا مگر سب بے کار۔ کچھوے نے اختر کو نہیں چھوڑا۔ سوامی نے تھوڑی سی ہمت کی اور وہ دوسرے کچھوے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تاکہ کچھوا زرینہ کی بجائے اُسے پکڑ لے۔ سوامی کی جاں نثاری دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا اور میں نے چلّا کر اُس سے کہا کہ وہ زرینہ کو لے کر دُور ہٹ جائے۔ زرینہ خود ہی کچھوے سے بچ رہی تھی اور اس کے مونہہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بجلی کا ننگا تار کچھوے کی آنکھوں میں لگا دوں تو شاید وہ اختر کو چھوڑ دے

یہ سوچ کر میں آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک آسمان سے چند چیلیں اُڑ کر آئیں اور میرے سامنے اپنے پر پھیلا کر چیخنے لگیں۔ وہ کسی بھی لمحہ میں مجھ پر حملہ کرنے والی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ میں نے دیکھا کہ میدان کی سمت سے پچاس فٹ اونچی گایوں کا ایک ریوڑ بڑی تیزی سے اس طرف آرہا تھا۔ اگر یہ ریوڑ محل تک پہنچ جاتا تو محل کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ یہ ریوڑ دُھول اُڑاتا ہوا آرہا تھا۔ گایوں کے پیچھے کچھ گھوڑے بھی تھے اور وہ بھی اتنے ہی اونچے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک زبردست زلزلہ آرہا ہو۔

محل کی زمین پر چند بڑے بڑے چیونٹے بھی رینگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ چیونٹے گدھے کی برابر اونچے تھے۔ میرے خدا! اب میں کیا کروں گا؟ خوف کے مارے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سوا خدا کے اب مجھے اور میرے ملازموں کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ چیلیں بس حملہ کرنے ہی والی تھیں۔ پہلا کچھوا اختر کو مونہہ میں دبائے سمندر کے قریب پہنچ چکا تھا اور دوسرا زرینہ کو دبوچنے ہی والا تھا۔ گایوں کا ریوڑ محل کی حدود میں داخل ہو چکا تھا اور دیوزاد چیونٹے اپنا مونہہ کھولے میری طرف بڑھ رہے تھے — بس ایک لمحہ کے اندر ہی میری تباہی یقینی تھی۔

پھر کیا ہوا؟ کیا فیروز، اور اس کے ساتھی بچ گئے۔ کوئی مدد آئی یا نہیں؟ یا پھر فیروز اور اُس کا محل تباہ ہو گیا۔ یہ جاننے کے لئے مارچ کا کھلونا پڑھنا نہ بھولنا۔

نیا سال نیا عزم
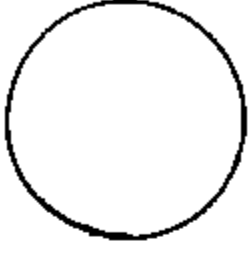
نسرین انجم

"چندا ماموں دور نہیں اب
ہم اتنے مجبور نہیں اب

سال نیا ہے، عزم نیا ہے
اوج پہ سائنسی دنیا ہے
چاند کو پانا مشکل کیا ہے

چندا ماموں دور نہیں اب
ہم اتنے مجبور نہیں اب

اپنے دم سے یہ نظارے
دھرتی کے سب پھول ہمارے
قدموں میں اب ہوں گے تارے

چندا ماموں دور نہیں اب
ہم اتنے مجبور نہیں اب

ساز کی اب جھنکار ہمیں ہیں
قدرت کے فنکار ہمیں ہیں
دنیا کے معمار ہمیں ہیں

چندا ماموں دور نہیں اب
ہم اتنے مجبور نہیں اب

کیا تم جانتے ہو ؟ کہ

* جیگا دراصل کون تھا اور فیروز کی پارٹی کے کون سے ساتھی کی شکل میں تھا ؟
* نجمہ کو کچھ لوگوں نے اغوا کر دیا —— کیوں ؟
* ایک فٹ کے بونوں کا زمیں دوز شہر جہاں پہنچ کر نجمہ اُن بونوں کی ملکہ بن گئی اور اپنے ساتھیوں کی جانی دشمن —— کیوں ؟
* بونوں کا خاص ہتھیار کون سا تھا جو انسانوں کو مفلوج کر دیتا تھا ؟
* بہت بڑی اور خونی چمگادڑوں کا خوفناک حملہ۔ اس حملہ سے کون کون لوگ بچے ؟
* ایسا ہیبت ناک اژدہا جو انسانوں کو زندہ نگل جاتا تھا، اُس کا انجام کیا ہوا ؟
* ڈھائی سو فٹ لمبے خوں خوار گرگٹ نے اپنے حملے سے کیا غضب ڈھایا ؟ * جیگا کی زمیں دوز دنیا کے عجائبات کیا تھے ؟ * آفاقی ہار اور سوبیا پر جیگا نے قبضہ کر لیا، لیکن پھر کیا ہوا ؟
* فیروز اور اس کے ساتھی صرف ڈیڑھ انچ کے بن گئے۔ اُس وقت ایک معمولی چوہے سے ان کی جنگ ہوئی۔ کون جیتا ؟ فیروز یا چوہا !
* بجلی سے چلنے والے لوہے کے انسان جو جیگا کے غلام تھے، مگر اختر اور نجمہ کے غلام بن گئے۔ انہوں نے کالی دنیا میں کیوں تہلکہ مچا دیا —— ؟
* اس کے علاوہ ناول کا خوب صورت انجام جو دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

آج ہی منگا یئے
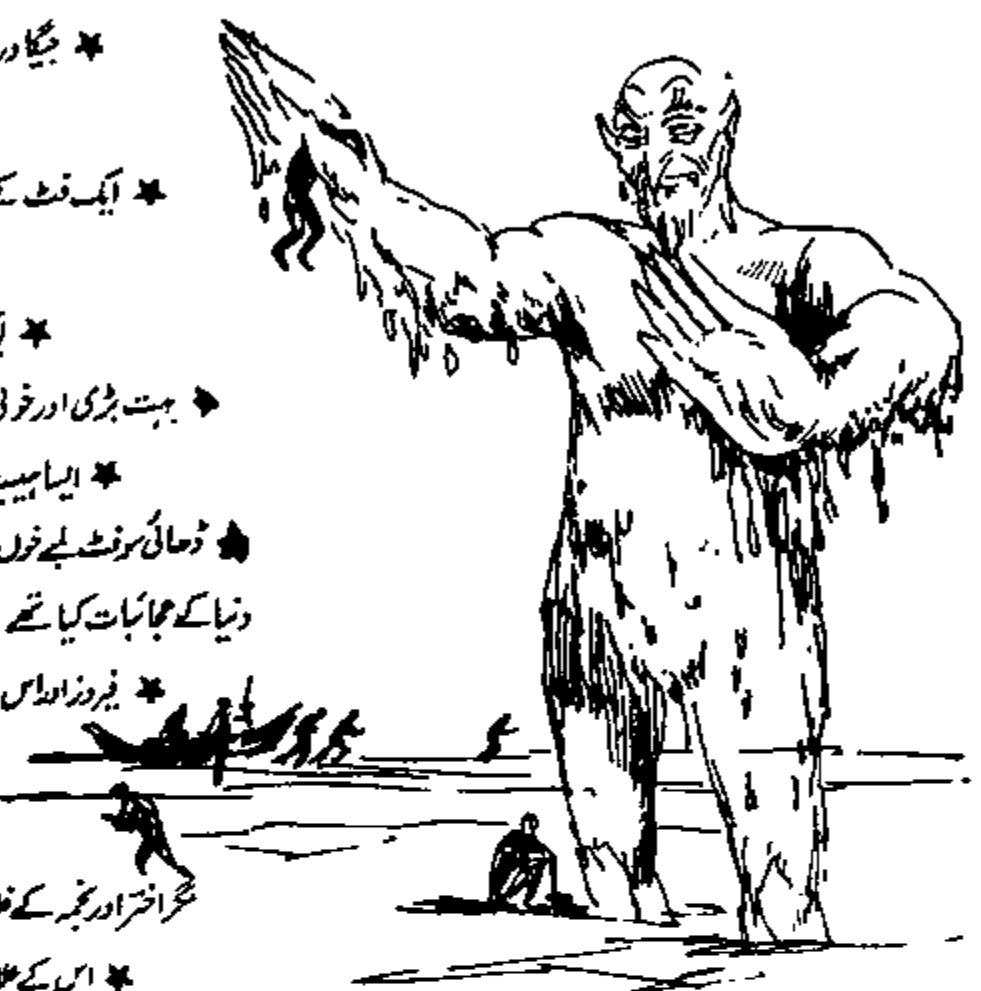
کالی دُنیا

اب کتاب کی صورت میں تیار ہوگیا

خوفناک جزیرہ (قیمت : پانچ روپے) کے بعد مصنف کا یہ دوسرا باتصویر ناول ہے جسے تم بے حد پسند کرو گے۔ بڑے کتابی سائز پر فوٹو آفسیٹ کے ذریعے چھپے ہوئے تقریباً ساڑھے چار سو صفحے کے اس ناول میں ایسے حیرت انگیز اور عجیب و غریب واقعات ہیں جن کو پڑھ کر تم دانتوں میں اُنگلی دے لوگے ! ہمیں یقین ہے کہ اتنا دلچسپ، اتنا عمدہ اور ایسا دل ہلا دینے والا ناول تم نے آج تک نہ پڑھا ہوگا۔

اِس خوب "موٹے تازے" اور دلچسپ ناول کے ساڑھے چار سو صفحے ہیں۔ فوٹو آفسٹ سے چھپا ہے قیمت صرف ساڑھے پانچ روپے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱

کام کرنے والے : سعادت یار خاں۔ سید مبرور علی۔ صہبا نظیر۔ احمد قدیر، بلقیس ریحانہ اور محبوب الرحمان

کہانی : امینہ دہلوی فوٹوگرافی : سراج انور ہدایات : الیاس دہلوی

(تصویری کہانی مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مدد سے بنائی گئی)

سعادت سڑک کے کنارے سیٹی بجاتا ہوا جا رہا تھا
کہ اچانک اُسے ایک
بیگ زمین پر پڑا ہوا دکھائی دیا —— "ہوں!
کوئی عورت اپنا بیگ گرا گئی ہے!"

"یقیناً اس میں روپے یا مٹھائیاں بھی ہوں گی!"
یہ سوچ کر
وہ بیگ کی طرف جھپٹا

مگر یہ کیا؟ — بیگ تو اس طرح سے اُڑا
جیسے اس کے پر لگ گئے ہوں۔ تیزی سے بیگ
جھاڑیوں کی طرف کھسکا
اور پھر اچانک قہقہوں کی آوازیں آئیں

سعادت نے دیکھا کہ جھاڑیوں کے دوسری
طرف اُس کے دوست کھڑے ہنس رہے ہیں اور بیگ
ہاتھ میں لئے اسے چڑا رہے ہیں
دراصل انہوں نے بیگ میں ڈوری باندھ رکھی تھی
تاکہ جیسے ہی سعادت
اُسے اٹھائے وہ بیگ گھسیٹ لیں

کچھ ہی دیر بعد بیچ پر بلقیس صاحبہ کا بیگ کہیں
گر گیا اور وہ اُسے
تلاش کرتی ہوئیں کچی سڑک پر اِدھر سے اُدھر
گھومنے لگیں

سعادت نے بھانپ لیا تھا کہ ایک سفید بیگ
زمین پر گرا ہوا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ
اس کے دوست اب بلقیس صاحبہ سے شرارت
کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ تیزی سے ان
کی طرف بڑھا ــــ "نہیں نہیں ٹھہر جایئے
اسے اٹھایئے گا نہیں

اور اس سے پہلے کہ بلقیس کچھ سمجھ سکتیں، سعادت
نے اپنے جوتے سے بیگ کو کچلنا شروع
کردیا "یہ لو ـــ یہ لو ـــ اب کرو شرارت!" وہ
وہ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔
بلقیس صاحبہ نے اسے روکنے کی کوششیں کیں
مگر اس نے ایک نہ سنی

مگر کچھ ہی دیر بعد اسکول کے ماسٹر محبوب الرحمان صاحب
اسے ڈانٹ رہے تھے
بلقیس صاحبہ کی شکایت پر اس کی خوب خبر
لی جا رہی تھی اور وہ غریب اپنی کمر
پر پڑتے ہوئے تھپڑوں کو برداشت کر رہا تھا
●●

رابعہ باٹلی والا

پانی کا بجلی گھر
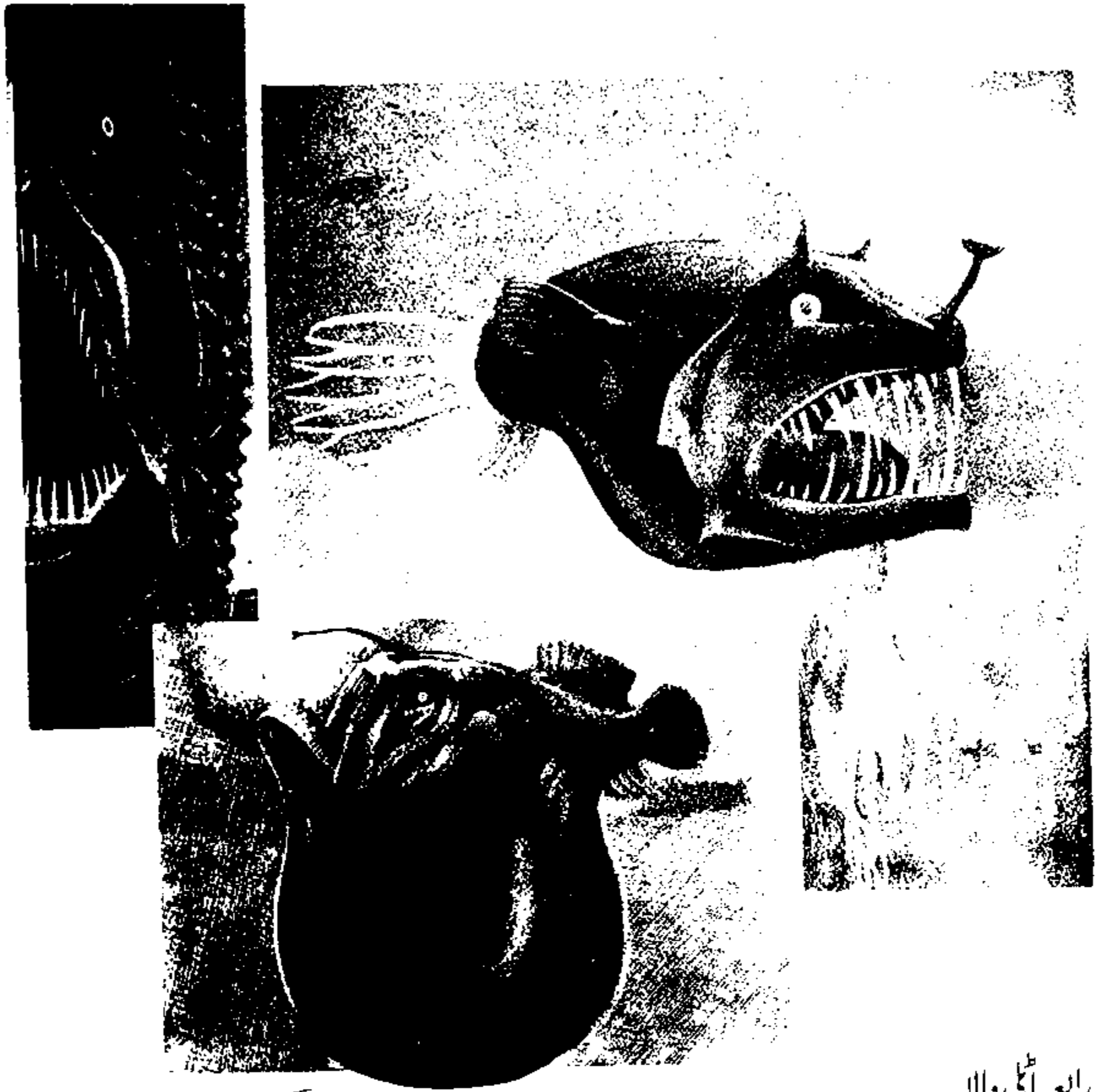
سمندر کی گہرائی میں بالکل تاریکی ہوتی ہے اس لئے ایک مچھلی دوسری مچھلی کو نہیں دیکھ پاتی۔ مچھلی کی غذا چونکہ مچھلی ہی ہے اس لئے اکثر مچھلیاں اس تاریکی کی وجہ سے بھوکی رہ جاتی ہیں لیکن سمندر کی ان تاریک گہرائیوں میں ایک ایسی مچھلی بھی ہے جو کبھی تاریکی کی وجہ سے بھوکی نہیں رہتی ——— اس مچھلی کو غذا کی کبھی بھی کمی نہیں ہوتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس مچھلی کو خوراک حاصل کرنے کے لئے زیادہ کوشش بھی نہیں کرنا پڑتی ہے کیوں کہ یہ روشنی پھینکنے والی مچھلی ہے۔ اس مچھلی کے سر میں ایک قسم کا جز جڑا ہوتا ہے جو بجلی

کرتا رہتا ہے ـــــ مچھلی جب چاہتی ہے اس بجلی سے اپنے سر پر لٹکا ہوا ایک بلب جلا لیتی ہے اور روشنی پھیلتے ہی اندھیرے میں بھٹکنے والی مچھلیاں خود ہی دَوڑ کر اُس کی غذا بن جاتی ہیں۔

سمندر کی اس عجیب و غریب مچھلی کا نام اینگلر ہے۔

یہ مچھلی زیادہ سے زیادہ چار انچ لمبی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے دانت اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ وہ اپنا مونہہ اچھی طرح نہیں بند کر پاتی۔ اس کے مونہہ کے اُوپری حصّہ پر سر کے قریب ایک لمبی اُنگلی ہوتی ہے جس پر سفید بال ہوتے ہیں اور جو دھاگے کی طرح اُنگلی پر لپٹے ہوتے ہیں اس اُنگلی کے سِرے پر ایک لوتھڑا سا لٹکا ہوتا ہے۔ جب یہ مچھلی بھُوکی ہوتی ہے تو اس لوتھڑے سے روشنی نکلنے لگتی ہے۔ روشنی اتنی تیز ہوتی ہے جیسے بجلی کا بلب جلنے لگے۔ مچھلیاں روشنی کی طرف لپکتی ہیں اور اینگلر کی خوراک بن جاتی ہیں۔ اکثر اوقات اینگلر اپنے سے تین گُنا بڑی مچھلی پر دانتوں سے حملہ کر کے اس کو سالم نگل جاتی ہے اور پھر ایک حیرتناک ڈرامہ سا شروع ہو جاتا ہے۔ چار انچ کی مچھلی بارہ انچ لمبی مچھلی جیسے ہی نگلتی ہے اس کا پیٹ ربڑ کے غبارے کی طرح پھول جاتا ہے۔ جب یہ مچھلی ہضم ہو جاتی ہے تو اینگلر کا پیٹ دوبارہ معمول پر آ جاتا ہے ـــــ اس سلسلے میں تعجب خیز اَمر یہ ہے کہ صرف مادہ اینگلر ہی مچھلی پکڑتی ہے۔ نر اینگلر ایک انچ سے بھی چھوٹا ہوتا ہے اور مستقل طور پر اپنی مادہ کے جسم سے چپکا رہتا ہے اور اسی جسم سے اپنی غذا حاصل کرتا رہتا ہے۔

جیسے ہی اینگلر کا پیٹ بھر جاتا ہے وہ روشنی بُجھا دیتی ہے اور عام مچھلیوں کی طرح گہرے سمندر میں تیرنا شروع کر دیتی ہے۔

■ ■

او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو!

غمؔ بہرائچی

دُنیا سے جہالت کے اندھیروں کو مٹاؤ
علم و ہنر و فضل کی مشعل کو جلاؤ
احسان سے پیمانِ محبت کو سجاؤ
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو!

روٹھی ہوئی دُنیا کو گلے بڑھ کے ملا دو
بھٹکے ہوئے انسانوں کو منزل کا پتا دو
خوابیدۂ غفلت ہیں جو اُن کو بھی جگا دو
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو!

دُشمن ہو کوئی اس سے بھی اخلاق سے پیش آؤ
بدخواہ کے دل کو بھی کبھی ٹھیس نہ پہنچاؤ
ہے لطف جبھی غم کی گھٹاؤں میں بھی مُسکاؤ
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو!

تاریخ کے اوراق کی زینت ہے تمہیں سے
پھولوں کے تبسم میں لطافت ہے تمہیں سے
آنکھوں میں زمانے کی بصیرت ہے تمہیں سے
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو!

قائم ہے تمہیں سے چمنِ ہند کی عظمت
اونچا ہوا نام اس کا تمہاری ہی بدولت
تم ہی کو ملی جوہر و گاندھی کی وراثت
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو!

تم چاہو تو تقدیرِ اُمم آج سنور جائے
گلشن سے خزاں دور ہو مستانہ بہار آئے
ہر شخص فقط پریم و محبت ہی کے گُن گائے
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو!

قہقہے

چیچک لگایئے
تین منٹ کی
صرف دو روپے
خرچ کرکے

اس دوا سے ٹھیک ہو جاؤ تو بتانا
مجھے بھی یہی بیماری ہے

نہیں
پیراشوٹ کھولنے سے
پہلے تم کو دس تک نہیں
صرف پانچ تک گننا

پے ــ پے
راشوٹ ــــ
کھو ــــ
کھولنے......

سورج نہیں نکلا

سعید امرت

کبھی چاند نہیں نکلتا، کبھی ستارے۔ کبھی بادل چلے آتے ہیں تو ایک کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ پھر اگر میں سورج بابا ایک دن اپنا موںہہ نہ دکھاؤں تو کیا حرج ہے؟ کب سے روز نکلتا ہوں ہزاروں لاکھوں سال سے، بلاناغہ، ذرا بھی تو آرام نہیں کیا میں نے۔ بس ایک دن تو ضرور میں آرام کروں گا۔ نہیں نکلوں گا نہیں نکلوں گا۔"

سورج بابا کے دل میں آرام کرنے اور ایک دن نہ نکلنے کی یہ بات بیٹھ گئی۔ چاند نے یہ بات سنی تو دوڑا آیا۔ سورج بابا سے کہا، بابا جی چھٹی نہ کرو، تمہاری روشنی دنیا کا اجالا ہے۔ غریبوں کی دولت ہے اور ان کی زندگی ہے۔

سورج بابا مسکرا کر بولا، تم خود تو آدھے آدھے مہینے آرام کرتے ہو، اور مجھ سے کہہ رہے ہو کہ آرام نہ کروں! تمہاری روشنی بھی تو دنیا میں اجالا پھیلاتی ہے۔ پھر تم کیوں کبھی اتنے بڑے، کبھی اتنے چھوٹے ہو جاتے ہو؟"

چاند نے دھیرے سے کہا: "سورج بابا، میں اندھیرے میں نکلتا ہوں۔ اندھیرا ہی میری منزل ہے۔ لاکھ روشنی پھیلاؤں پھر بھی اندھیرا باقی رہتا ہے۔ تم تو اجالے کا اجالا ہو۔ جو چاہتے ہو وہی ہوتا ہے۔ تمہاری بات بالکل الگ ہے!"

لیکن سورج بابا نے جو بات دل میں ٹھان لی تھی وہ پوری

کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ لاکھ سمجھانے بجھانے کے باوجود سورج بابا آسمان سے نیچے اتر آئے اور آتے ہوئے کہتے آئے کہ بس جا رہا ہوں، دو چار، دس، بیس دن میں، جب میرا جی چاہے گا واپس لوٹوں گا، کوئی فکر نہ کرے۔"

کوئی فکر کیسے نہ کرتا؟ چاند نے لاکھوں سال دنیا دیکھی تھی۔ اس نے آسمان کو دیکھا۔ وہ صاف تھا۔ نیلا اور خوبصورت گرمی کے دن تھے۔ ان دنوں میں ابر نہیں ہوتا۔ لیکن جب چاند نے آسمان سے کہا" سورج بابا انسانوں کی دنیا میں چلے گئے ہیں، اب تم ان کے واپس آنے تک اپنے اوپر ابر کا سایہ کر لو۔ اس طرح کسی کو پتہ نہیں چلے گا، کہ سورج بابا اپنے کام پر نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سورج بابا جلد لوٹ آئیں گے۔ بہت جلد لوٹ آئیں گے۔

آسمان نے چاند کی بات مان لی۔ اور آن کی آن میں ابر کے ڈھیر لگا دیتے ہر طرف ابر کے ٹکڑوں نے قبضہ کر لیا۔

صبح ہو رہی تھی کہ سورج بابا زمین پر اتر آئے۔ انہوں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا، اور اپنی روشنی کی بجائے ابر کے ٹکڑوں کو دوڑتا بھاگتا دیکھ کر مسکرا دیئے۔ دل ہی دل میں بولے کتنی دیر کھیلو گے؟ گھنٹے، دو گھنٹے؟ پھر تو تھک کر چلے ہی جاؤ گے اب تو میں زمین پر اتر آیا ہوں، واپس نہیں جاؤں گا۔"

سورج بابا جہاں جا کر رکے وہاں ایک مکان بن رہا تھا دیواریں اٹھ چکی تھیں۔ اب چھت کی باری تھی۔ مزدور اپنا سامان سمیٹے بیٹھے آسمان کو تک رہے تھے۔ سیمنٹ بجری بنانے والی مشین رکی ہوئی تھی۔ پھاوڑے اور کدالیں بے جان سی رکھی تھیں۔ سب خاموش اور چپ چاپ سے تھے۔ سورج بابا نے ایک مزدور سے پوچھا۔ ارے بھائیو، کام کیوں نہیں کرتے؟ مسالہ بناؤ۔ چھت پر ڈالو۔"

ایک مزدور بولا" ارے بابا۔ ٹھیکے دار نے بول دیا ہے

سورج نکلے تو چھت پر مسالہ ڈالے گا ورنہ نہیں۔ ابر چھا رہا ہے دھوپ نہیں نکلی اور اگر بوندا باندی ہو گئی تو چھت بیٹھ جائے گی۔ ٹھیکیدار بھی کوئی غلط بات نہیں کہتا۔ اب خدا جانے کب ابر ہٹے گا اور کب سورج نکلے گا۔ خدا کرے جلدی نکلے جو دن کو مزدوری پوری ہو اور شام کو گھر لوٹتے ہوئے بچوں کی روٹی کے لئے پیسے جیب میں ہوں ہماری۔"

سورج بابا بولے۔ ارے بھائی ایک روز سورج نہ نکلے تو کیا ہو گیا۔ کل سہی!"

مزدور بولا" تمہارا پیٹ نہیں ہے کیا؟" ایک روز روٹی کھانے کو نہ ملے تو پتہ چلے۔ تارے ناچنے لگیں گے۔ تارے!"

سورج بابا جلدی سے وہاں سے چل دیئے۔ بات دل کو لگی تھی۔ لیکن وہ ضد کے پکے تھے۔ اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔

ذرا دور ایک کھیت کے کنارے ایک کسان اور اس کے ساتھی چارپائیوں پر بیٹھے آسمان تک رہے تھے۔ پاس ہی حقہ رکھا تھا۔ سورج بابا دعا سلام کر کے ان میں جا بیٹھے حقے کا دم لگا کر بولے" بھائیو، ایسے کیسے بیٹھے ہو؟ بولو، بات چیت کرو، ہنسو، گاؤ!

"ہنسیں کیسے بابا جی؟ ایک کسان بولا" آج بالیں خشک کرنے کا آخری دن تھا۔ آدھے دن کی کھلی دھوپ بھوسے کو اڑا دیتی اور چھان پھٹک کر سارا گیہوں ہم بوریوں میں بھر دیتے پر آج ابر ہے۔ دھوپ کا پتہ نہیں۔ گیہوں میں تری ہے بھوسہ کیسے نکلے گا۔ منڈی میں مال کیسے جائے گا۔

سورج بابا ذرا گرم ہو گئے بولے، اگر سورج نہیں ہے تو نہ سہی تم اپنے گھر میں ایندھن جلاؤ اور وہاں گرمی پیدا کر کے گیہوں کا بھوسہ اتار لو!

خوب۔! کسان نے مسکرا کر کہا۔ ارے بھولے بابا جی

جتنے کا سارا گیہوں بیچے گا اتنے کا ایندھن جلائیں تب بھی گیہوں کا بھوسہ نہیں اترے گا۔ یہ کام تو سورج اور اس کی دھوپ ہی کا ہے۔ اس کے بغیر گیہوں خشک نہیں ہوگا۔"

سورج بابا سوچ میں پڑ گئے۔ سوچا، چلو واپس چلیں۔ واقعی دنیا والوں کو میری ضرورت ہے۔ میرے بغیر بہت سے کام رک جاتے ہیں اور میری وجہ سے کسی کو تکلیف ہو کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن سورج بابا کا دل نہیں مانا۔ وہ تو یہی کہتے رہے۔ "آج تو چھٹی رہے گی آج تو دھوپ نہیں نکلے گی۔ آج تو کام نہیں ہوگا۔"

سورج بابا نے دل کی بات پھر مان لی اور آسمان پر جانے کی بجائے آگے چل دیئے۔

ایک جگہ ایک بچے کو روتے دیکھ کر سورج بابا رک گئے یہ بچہ گھر کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھا تھا کپڑے بھی میلے میلے سے تھے۔ بابا کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بچے نے آنسو پونچھ لئے اور چپکا ہو رہا۔

سورج بابا بچے کے قریب گئے۔ دیکھا معصوم سا خوبصورت بچہ تھا۔ عمر کوئی آٹھ نو سال کی ہو گی۔ اسے چپکا دیکھ کر سورج بابا بولے، روکیوں رہے تھے بیٹے؟

بچے نے سورج بابا کو غور سے دیکھا۔ اور پھر جواب دیا،

"آج میرا امتحان ہے۔"

"تو پھر امتحان سے ڈر کر رو رہے ہو؟"

"نہیں، نہیں۔" بچہ تیزی سے بولا۔ میں امتحان سے نہیں ڈرتا۔ مجھے اسکول جانا ہے۔"

"اچھا۔" سورج بابا نے مسکرا کر کہا، اسکول جانے سے ڈرتے ہو۔ اس لئے رو رہے ہو!"

بچہ بولا۔ میں اسکول جانے سے نہیں ڈرتا۔ میری ماں کہتی ہے، ڈرنے والے بچے دھرتی کا بوجھ ہوتے ہیں۔ میں اپنے خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ میرے ابا جی بھی کسی سے نہیں ڈرے۔ انہوں نے ہمارے ملک کے دشمن کے سامنے بندوق اٹھائی تھی۔ اور بہت دن ہو گئے وہ واپس نہیں آئے۔" اماں کہتی ہیں، وہ بڑے اچھے تھے۔ اللہ میاں نے ان کو اپنے پاس روک لیا ہے اس لئے میں بھی نہیں ڈرتا اور میں بھی اچھا آدمی بنوں گا

"اچھا جب یہ بات ہے تو تم روکیوں رہے تھے میرے ننھے؟ سورج بابا نے بچے کو پیار کر کے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

آج میرا امتحان ہے نا۔ رات کو میری ماں نے میرا نیکر میری قمیض اور موزے دھو کر پھیلا دیتے تھے۔ رات کو کپڑے کیسے سوکھتے؟ اور اب سورج نہیں نکلا۔ کپڑے گیلے ہیں۔ بالکل گیلے۔ میں گیلے کپڑے کیسے پہنوں گا؟ کپڑے نہیں پہنوں گا تو اسکول کیسے جاؤں گا؟ اسکول نہ گیا تو امتحان کیسے دوں گا؟ اس لئے رو رہا ہوں۔ سورج تو روز نکلتا ہے۔ آج کیا اس لئے نہیں نکلا کہ میرے کپڑے گیلے رہیں، میں امتحان میں نہ جاؤں اور پیچھے رہ جاؤں۔"

سورج بابا نے بچے کو گود سے اتار دیا۔ سوچا اور بولے، میرے ننھے، میرے لعل، تم امتحان دینے ضرور جاؤ گے۔ سورج ابھی نکلے گا، ضرور نکلے گا۔ تم کسی سے پیچھے نہیں رہو گے، یہ ممکن ہے کہ کسی مکان کی چھت بنتے بنتے رہ جائے۔ کہیں گیہوں کی بالیں گیلی رہ جائیں، لیکن تمہارے کپڑے گیلے نہیں رہ سکتے، وہ ابھی سوکھ جائیں گے تم اسکول جاؤ گے۔ امتحان دو گے، پاس ہو گے۔ بس ذرا ذرا اپنی آنکھیں بند کر لو۔

ننھے نے سورج بابا کا کہا مانا۔ ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں۔ اور جب کھولیں تو ہر طرف چمکتی دھوپ نکھری ہوئی تھی ننھے کے کپڑے تیزی سے سوکھ رہے تھے اور سورج بابا نے چھٹی منانے سے توبہ کر لی تھی۔

■ ■

ایک سوال
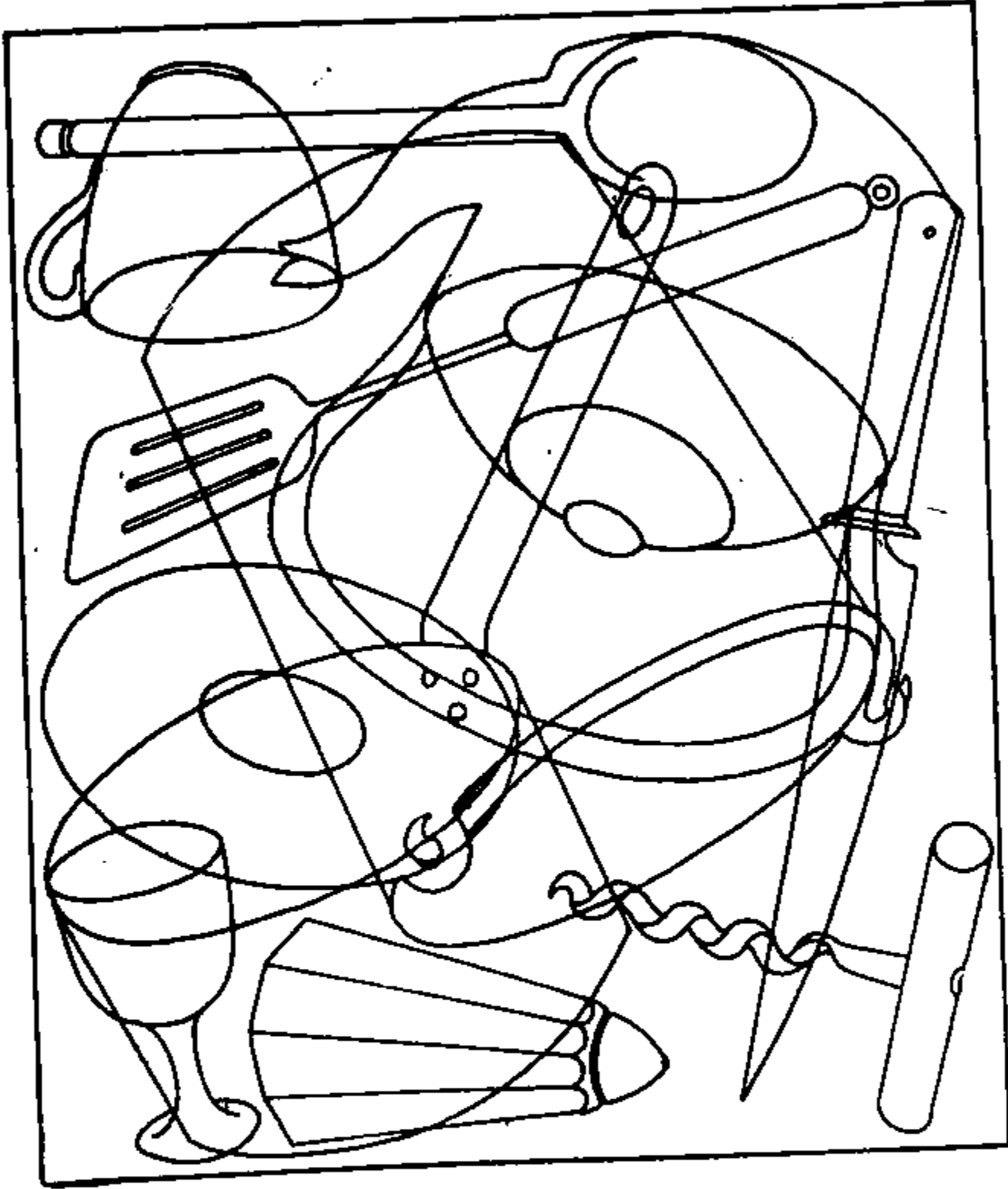
ننھے میاں باورچی خانے میں گئے اور سارے برتن اور باورچی خانے کی دوسری چیزیں گرادیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو یہ کتنی چیزیں ہیں — اور کون کون سی ہیں؟ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر رسالہ نامے میں شائع ہونے والے تمام انعامی مقابلوں کے جواب ایک ہی لفافہ میں علیحدہ علیحدہ کاغذ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں) "ایک سوال" ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۴ر فروری ۱۹۶۹ تک ملنے والے جوابوں میں جو جواب صحیح ہوں گے ان میں سے دس بہن بھائیوں کو دو، روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔ ●●

ایک سوال، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱

واجدہ تبسم

میں کیوں روئی

کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے۔

میری اور نیلو کی دوستی سب کے لئے قابل حیرت تھی۔ بات تھی بھی حیرت کی۔ وہ لمبی سی چمکتی ہوئی کار میں اسکول آتی تھی۔ وہ روز ایک نئی فراک پہن کر آتی تھی۔ اس کے جوتے ہمیشہ فراکوں سے میل کھاتے اس کی چوڑیاں، اس کے رنگ برنگی ربن، اس کی آیا — جو چیز دیکھو ایسی چم چماتی ہوئی اور بھڑکیلی جیسے وہ کوئی شہزادی ہو — اور میں ایک غریب سی ننھی لڑکی، جس کے پاس لے دے کے ایک ہی فراک تھی، جسے امی دھوکر سکھانے ڈالتیں تو اتنی دیر کے لئے میں بھیا کی قمیض پہنے رہتی۔

یہ دوستی کیسے ہوئی، اس کا علم نہ مجھے تھا۔ نہ کسی اور کو، نہ خود نیلو کو۔ بس پہلی بار ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ مسکرائی تو میں بھی ہنس دی۔ ننھی منی معصوم کلیوں کی سی پاکیزہ ہنسی نے جیسے ہم دونوں کو پیار کے دھاگے میں باندھ دیا۔ نہ میں نے کبھی اس کی کسی اچھی چیز کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا، نہ کبھی یہ ظاہر کیا کہ میں نے دوستی کا ہاتھ اس کی دولت سے مرعوب ہو کر بڑھایا تھا۔ نہ کبھی نیلو ہی نے اپنی امارت کا رعب مجھ پر ڈالا۔ ہم دونوں ایک ہی سطح پر رہ کر سوچتی تھیں۔ بس ہم میں یہی ایک احساس مشترک تھا کہ ہم دونوں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں اور سہیلیاں ہیں نیلو کی دوستی نے کبھی مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں کیا اور نہ کبھی میں روئی۔

ہماری دوستی اتنی بڑھی کہ سب ہمیں ایک دوسرے کا سایہ کہنے لگے ــــ ہمیں کتنوں ہی نے لڑانے کی کوشش کی، لیکن ہماری محبت اتنی گہری تھی کہ ہم کبھی لڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

لیکن ایک دن ہماری لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

ہماری دوستی ہوئے کوئی سال بھر ہونے کو آیا تھا کہ نیلو کی سال گرہ کا دن آ پہنچا۔ اس سال گرہ کی تفصیل میں کیا بیان کروں؟ میری ننھی سی عمر کا وہ پہلا ایسا ہنگامہ تھا جسے میں نے خوابوں اور پریوں کے دیس کا سا کوئی واقعہ سمجھا۔ یہاں سے وہاں تک رنگین بلب ــــ پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی۔ بہت سارے خوب صورت بچے، بچیاں ــــ بے حد حسین چمک دار بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے۔ ایک طرف بینڈ بج رہا تھا۔ میں وہاں کیسے پہنچ گئی تھی۔ ظاہر ہے میری سہیلی کی سال گرہ جو تھی۔ اور عید پر جو میری فراک بنی تھی وہی اُس دن کام آئی ــــ بس ایک غم تھا کہ میں ساتھ کوئی تحفہ نہ لے جا سکی ــــ میں بھلا کیا لے جاتی؟ میرے پاس پیسے ہی کہاں تھے؟ لیکن نیلو نے اس قدر اصرار سے بلایا تھا کہ ناممکن تھا کہ میں نہ جاتی۔

ایک بڑی سی میز پر کھانے پینے کا اتنا سامان رکھا تھا کہ حد نہیں اور دوسری میز جو اس سے کہیں بڑی تھی، تحفوں سے لدی ہوئی تھی۔ شرم کے مارے میرا برا حال تھا ــــ سب ہی سوچیں گے کہ میں نے کیا دیا۔ اُسی دم ایک عجیب و غریب کارروائی شروع ہو گئی ــ ایک چھوٹی سی تپائی پر نیلو چڑھ کر کھڑی ہو گئی اور ہر ایک کے تحفے کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا کانوں میں سائیں سائیں سی ہو رہی تھی، دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس محفل سے نکل بھاگوں۔ کوئی سوچے نہ سوچے، میں خود اس قدر نادم تھی کہ کسی طرح اس جگہ سے چھٹکارا پانا چاہ رہی تھی۔ اُسی لمحے نیلو نے بڑے پیارے اعلان کیا ــــ

"اور آج کا سب سے پیارا تحفہ میری سب سے پیاری سہیلی ستو نے دیا ہے۔ اس نے ہاتھوں میں اوپر اٹھا کر سب کو ایک تاج محل دکھایا، جس میں چھوٹے چھوٹے بلب لگے ہوئے تھے ــــ سنگِ مرمر کا حسین و جمیل تاج محل ــــ مارے جگمگاہٹ کے کسی کی اُس پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر نیلو کو دیکھا۔ نیلو نے بھی مجھے دیکھا اور پیار سے ہنس دی۔ اور یوں سال گرہ کی خوشی والے دن جب کہ آنسو بُرا شگون سمجھے جاتے ہیں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ جب ایک ایک کر کے سب مہمان چلے گئے تو نیلو میرے پاس آئی۔ بے حد محبت سے مجھے گلے لگا کر بولی:

"میری اچھی ستو ــــ میں سب کے سامنے تجھے شرمندہ ہونے کا موقع کیسے دے سکتی تھی؟ تو نے بُرا تو نہیں مانا؟"

بس وہی ایک لمحہ تھا جب ہماری لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ لیکن میں لڑی جھگڑی نہیں۔ بس روتے گئی، روتے گئی۔

اور اب اتنے سال گزرنے پر میں سوچتی ہوں کہ میں بھی کیسی پاگل تھی جو اُس دن رونے بیٹھ گئی تھی۔ یہ تو خوشی کی اور ہنسنے کی بات تھی نا؟ سچی دوستی وہی تو ہوتی ہے کہ ایک سہیلی دوسری سہیلی کا درد اپنا لے۔ آج میں اُس دن کے بارے میں کبھی اس انداز سے نہیں سوچتی کہ میں کیوں روتی تھی۔

■■

نئے سال کا کلنڈر

ہر نئے سال، وقت جاتے ہوئے
گئے لمحوں کو گِن کے روتا ہے
اُن ہی لمحوں کی تیرگی سے مگر
نیا سورج طلوع ہوتا ہے

روشنی زندگی کی قیمت ہے
کوئی احساس یہ دِلاتا ہے
ہر گھڑی اک حسین نعمت ہے
اک پیامی پیام لاتا ہے

احمد وصی

ہر نئے سال مسکراتا ہوا
دن نکلتا ہے آب و تاب کے ساتھ
نئی کرنوں کے جال بُنتی ہیں
روشنیاں بھی آفتاب کے ساتھ

وہ ، جو ہر سال کا پیمبر ہے
اور کوئی نہیں کلنڈر ہے

کالا سوار

سُرجیت

مدتوں پہلے کی بات ہے، ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا جو شہر شہر، بستی بستی اور گاؤں گاؤں گھومتا پھرتا تھا۔ اُس قبیلے کا سردار بہت بہادر تھا۔ اونچا تگڑا اور خوب صورت اس کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ لوگوں نے اسے ہمیشہ گھوڑے پر سوار دیکھا تھا، اس لئے وہ اس کو محبت سے کالا سوار، کہا کرتے تھے۔

ایک بار قبیلے پر کچھ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ کالے سوار نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈاکوؤں کو للکارا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بیس ڈاکو وہیں مر گئے۔ پندرہ ڈاکوؤں کو انھوں نے گرفتار کر لیا۔ باقی ڈاکو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔

اس واقعہ سے چاروں طرف کالے سوار کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی۔ ڈاکو، چور اور لٹیرے کالے سوار سے خوف کھانے لگے۔ وہ بھول کر بھی اس قبیلے کے قریب نہیں پھٹکتے
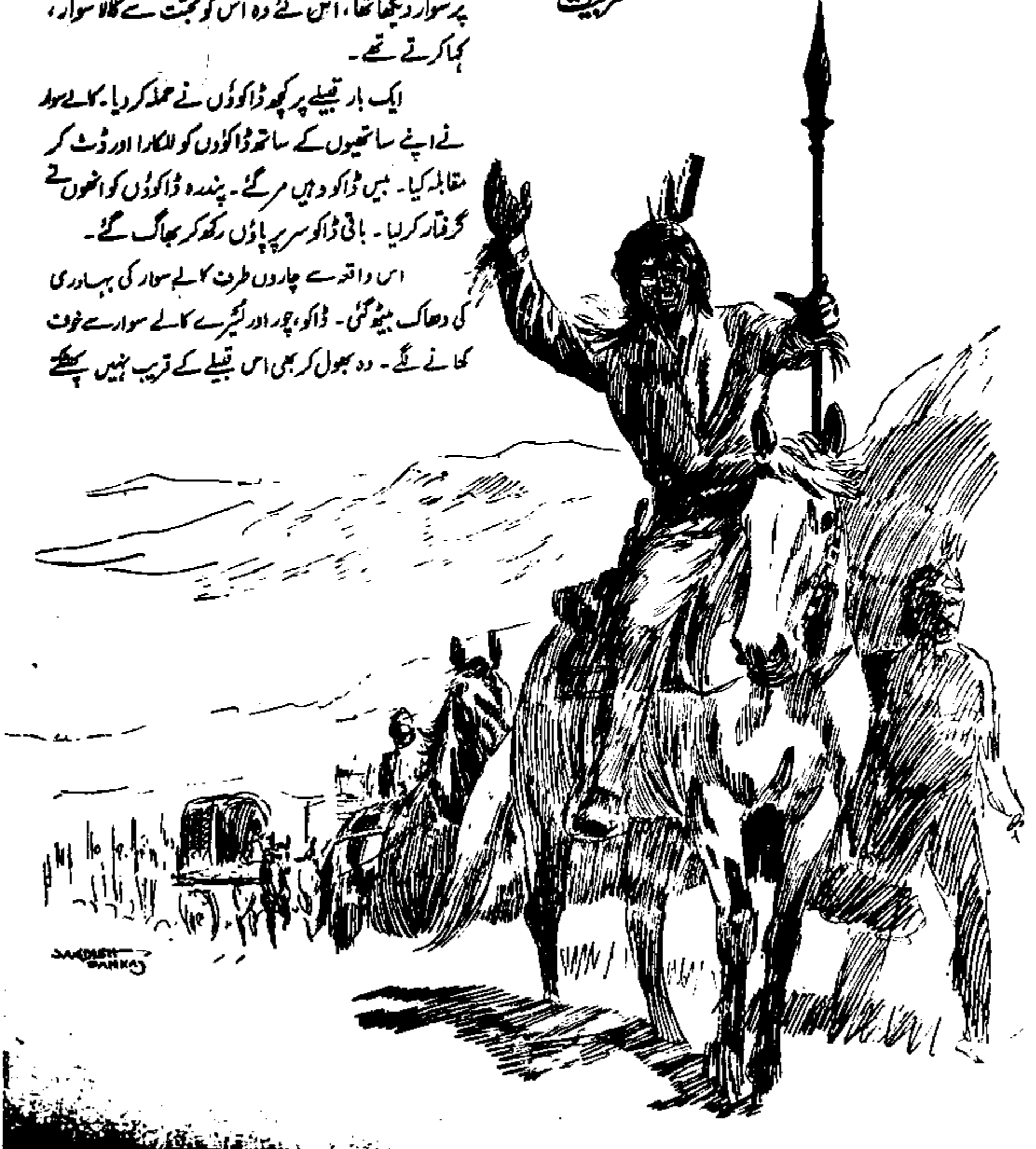
تھے۔ لیکن پھر بھی کالا سوار چوکنا اور محتاط رہتا تھا۔ اُس نے اپنے بہادر ساتھیوں کو ہتھیار چلانے میں ماہر کر دیا تھا۔

اسی طرح بہت دن اطمینان سے گذر گئے۔ ایک دن کی بات ہے۔ یہ قبیلہ قافلہ بنا کر ریگستان میں سے گذر رہا تھا۔ قبیلے کے لوگ بیل گاڑیوں اور اونٹوں پر سوار تھے۔ وہ دن میں آرام کرتے اور رات کو سفر پر نکلتے۔ کالا سوار اور اُس کے بہادر ساتھی قافلے کو چاروں جانب سے گھیرے ہوئے اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

اُس ریگستان میں لٹیروں کا ایک گروہ رہتا تھا۔ وہ بھولے بھٹکے مسافروں کو لوٹ لیتا تھا۔ اُنھوں نے اِس قافلے کو دیکھا تو اُن کے مونہہ میں پانی بھر آیا، لیکن کالے سوار کو قافلے کے ساتھ دیکھ کر اُن پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن لالچ انھیں اُکساتا رہا۔ وہ کافی فاصلہ رکھ کر قافلے کا پیچھا کرنے لگے۔

لٹیروں کو اس طرح قافلے کا تعاقب کرتے ہوئے چار دن گذر گئے، لیکن کالے سوار کے خوف سے وہ اس پر حملہ نہ کر سکے۔ ایک دن ایک لٹیرے نے کالے سوار کو نشانہ بنا کر زہریلا تیر چھوڑا۔ تیر کالے سوار کے بازو پر آ لگا۔ بازو سے خون کا فوارہ بہہ نکلا، لیکن کالا سوار گھبرایا نہیں۔ اُس نے ہاتھ سے بازو کا گھاؤ دبایا اور گھوڑے سے اُتر پڑا۔ پھر اُس نے قافلے کو رُکنے کا حکم دیا اور اپنی بیوی کے پاس پہنچا جو بیل گاڑی میں سوار تھی۔ اُس کی بیوی اتنا بڑا گھاؤ دیکھ کر گھبرا گئی، لیکن کالے سوار نے اُس کو دلاسہ دیا اور گھاؤ کی مرہم پٹی کرنے کے لئے کہا۔ اُس کی بیوی نے گھاؤ کی مرہم پٹی کر دی۔ کالے سوار کو اب معلوم ہو گیا تھا کہ لٹیرے اُن کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر مشورہ کیا اور اُن کا جوش بڑھایا۔

اب صرف ایک رات کا سفر باقی تھا۔ اگلی صبح قافلہ اپنی منزل پر پہنچنے والا تھا۔ کالا سوار بہت زخمی تھا، اس لئے اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اُس رات وہ اُس کی پوشاک پہن کر اور ہاتھ میں بھالا لے کر گھوڑے پر سوار ہو جائے تاکہ لٹیرے یہی سمجھیں کہ کالا سوار ہی قافلے کی حفاظت کر رہا ہے۔

رات ہوئی۔ چاند نکلا۔ قافلہ آگے کی جانب چل دیا۔ کالے سوار کی بیوی اُس کی پوشاک پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار تھی۔ لٹیرے کچھ فاصلہ پر چٹانوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے اُن کا تعاقب کر رہے تھے۔ اُن کو امید تھی کہ کالا سوار ضرور مر گیا ہو گا اور اگر مرا نہیں تو زخمی ضرور ہوا ہو گا۔ لیکن اُنھوں نے دیکھا کہ کالا سوار اسی طرح گھوڑے پر سوار قافلے کے ساتھ چل رہا ہے۔ لٹیرے اُس کی بے پناہ بہادری کو جانتے تھے۔ اس لئے وہ حیران نہیں ہوئے۔ لٹیروں کے سردار نے کہا۔ کالا سوار قافلہ کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس لئے قافلے پر حملہ کرنے کی غلطی نہ کرنا۔

کچھ گھنٹے اِسی طرح تعاقب کرتے ہوئے گزر گئے پھر لٹیروں کے سردار نے کہا۔ مجھے کالے سوار پر شک ہو رہا ہے۔ یہ کالا سوار نہیں، اُس کی بیوی معلوم ہوتی ہے اب اُس سے ہتھیار سنبھالے نہیں جا رہے ہیں۔ گھوڑے کی لگام اُس کے ہاتھ سے کھسکتی جا رہی ہے۔ بھالا اُس کے ہاتھ سے بار بار زمین پر گر رہا ہے۔ دُور سے اُس کا چہرہ سفید سا نظر آ رہا ہے جب کہ کالے سوار کا چہرہ کالا ہے۔ یہ کسی طرح بھی کالا سوار نہیں ہو سکتا۔

سردار کے ساتھیوں کو اِس بات کا یقین نہ آیا۔ وہ اچانک حملہ کر کے اپنی جان مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اُن کو فکر مند دیکھ کر سردار سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ سوچ کر اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "آؤ! ہم ان پر حملہ کرنے کا ڈھونگ رچائیں۔ ہم لڑائی کا اعلان کرتے ہوئے قافلے کے اتنے قریب سے گزریں کہ اُن پر حملہ بھی کر سکیں اور اپنا بچاؤ بھی" اُس کے ساتھی رضامند ہو گئے۔

وہ گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے اور لڑائی کا اعلان کرتے ہوئے قافلے کے قریب سے گزرے۔ سارا ریگستان اور چٹانیں اُن کے

شور و غل سے گونج اٹھیں۔ کالے سوار کے ساتھی اپنے سردار کے بغیر "پانی بغیر مچھلی" کی طرح تھے۔ وہ خوف سے کانپ اٹھے۔ کالے سوار کی بیوی بھی کانپ گئی۔ لیکن کالے سوار کے خوف سے لٹیرے پھر بھی قافلے کے قریب نہ آئے۔ کالا سوار اُس وقت ایک بیل گاڑی میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے یہ شور و غل سنا تو اُس کا خون کھول اُٹھا۔ وہ اپنے گھاؤ کی فکر کئے بغیر بیل گاڑی سے کود پڑا اور باہر نکل کر گرجا۔ "بدمعاش لٹیرو! بھاگ کر کہاں جا رہے ہو! ہمت ہے تو قریب آکر لڑو۔"

کالے سوار کو دیکھتے ہی اُس کے ساتھیوں کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ اُن کا جوش لوٹ آیا۔ اُنھوں نے لٹیروں کے مقابلے کے لئے تلواریں نکال لیں لیکن لٹیرے بغیر پیچھے دیکھے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کالے سوار نے اپنی بیوی کو بیل گاڑی کے اندر بھیج دیا اور خود اپنی پوشاک پہن کر زخمی حالت میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

کالے سوار نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور صلاح و مشورہ کیا۔ اُس نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "اب تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک وادی میں سے گزریں گے۔ اُس وادی میں ایک چھوٹا سا درّہ ہے۔ میں اُس درّہ پر پہرہ دوں گا۔ تم سب لوگ قبیلے کو ساتھ لے کر اُس کو تیزی سے پار کر لینا۔ اُس کے بعد صرف ایک گھنٹے کا سفر ہے پھر تم لوگ شہر میں پہنچ جاؤ گے۔ دن نکلتے ہی میں تمہارے ساتھ آ ملوں گا۔"

تھوڑی دیر میں قافلہ درّہ میں پہنچ گیا۔ کالا سوار درّہ پر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک چٹان کے پاس اپنے گھوڑے کو کھڑا کر لیا اور ہاتھ میں بھالا سنبھال لیا۔ آہستہ آہستہ تمام قافلہ درّہ میں سے گزر گیا۔ اُس کی بیوی بھی بھیگی آنکھوں سے اُس کو دیکھتی ہوئی قافلے کے ساتھ چلی گئی۔ لیکن کالا سوار وہیں کھڑا رہا۔

لٹیروں نے قافلے کا تعاقب نہیں چھوڑا۔ کچھ دیر میں وہ بھی وادی کے قریب پہنچ گئے۔ وہ چٹانوں کی اوٹ سے کالے سوار پر حملہ کر سکتے تھے لیکن ایسا کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ وہ تعداد میں تیس تھے اور کالا سوار اکیلا تھا، لیکن پھر بھی وہ اُس سے ڈر گئے۔ وہ اُس کی ہر حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ لٹیروں کے سردار کے دل میں کالے سوار کے لئے احترام پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے ساتھیوں کو اس پر تیر چھوڑنے سے بھی منع کر دیا تھا۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ لیکن کالا سوار وہیں ڈٹا ہوا تھا۔ سورج نکل آیا پھر بھی وہ وہاں سے ہٹا نہیں۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ کالا سوار اُسی طرح اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ لٹیرے حیران تھے۔ وہ ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھے۔ اب وہ کالے سوار سے صرف کچھ گز کی دُوری پر تھے۔ وہ اس پر حملہ کر سکتے تھے اور اپنی حفاظت بھی۔ لیکن کالا سوار بت کی طرح کھڑا تھا۔ اُسی وقت اچانک ایک لٹیرے کے گھوڑے نے کالے سوار کے قریب کی چٹان سے ٹھوکر کھائی۔

چٹان لڑھک گئی اور کالا سوار چٹان کے سہارے سے محروم ہو کر زمین پر آگرا۔ اس کو گرتا دیکھ کر گھوڑا بے چین ہو اٹھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُس کے مالک پر کوئی آفت آگئی ہے۔ وہ اُس کو اٹھا کر بھاگنے ہی والا تھا کہ لٹیرے اور ان کا سردار کالے سوار کے قریب پہنچ گئے۔ ایک لٹیرے نے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ سردار نے کالے سوار کی نبض کو چھو کر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ کالے سوار کو مرے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ لٹیروں کے سردار کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ پچھتاوے سے اس کا دل رو اٹھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "آج ہم لوگوں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے ایک بہادر کی جان گئی۔" پھر اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کالے سوار کی ایک سمادھی بنا دی۔ انھوں نے اُسی دن سے لوٹ کھسوٹ بھی چھوڑ دی اور ایمان داری سے زندگی بسر کرنے لگے۔

●●

خدائی

صغیر احمد صوفی

ہم سے نہ لکھائی ہوتی ہے ہم سے نہ پڑھائی ہوتی ہے
اس واسطے درجے میں یارو! ہر روز پٹائی ہوتی ہے

حلوائی کی دوکاں کی اس دن قیمت میں گھٹائی ہوتی ہے
جس دن کہ ہمارے 'ڈیڈی' کی پاکٹ کی صفائی ہوتی ہے

کل میرے 'ٹفن' کے ڈبے سے بسکٹ کھا کر ٹیچر بولا
اُس چیز کو بچّو! مت چھُونا، جو چیز پرائی ہوتی ہے

'ایگزام' جو سر پر آتا ہے جی اپنا بہت گھبراتا ہے
ریزلٹ نکلنے پر یارو! پھر جگ میں ہنسائی ہوتی ہے

درجے کی 'ڈسپلن' اُف توبہ، ہر گام پہ سو سو پہرے ہیں
دیکھیں تو بھلا اس بندھن سے کس روز رہائی ہوتی ہے

سرکس کا وہ جوکر چیتے کی اک کھال پہن کر کہتا تھا
اس دیس میں بھیس بدلنے میں اب اپنی بھلائی ہوتی ہے

اک دوست ہمارا ہاتھوں کے کچھ داغ دکھا کر یوں بولا
کیا اس سے زیادہ اور کسی کالج میں پٹائی ہوتی ہے

چھوٹے ہیں ابھی نادان ہیں ہم، پر اپنے وطن کی شان ہیں ہم
ہم ایسے جیالوں کی دُشمن، کیوں ساری خدائی ہوتی ہے

بے وقوف بندر
۴۰ نئے پیسے
سات رنگوں میں چھپی ہوئی
کتابیں جو کسی بھی زبان کی
بہترین چھپی ہوئی کتاب
کے مقابلہ میں رکھی
جا سکتی ہیں
ہر کتاب دل چسپ۔ ہر صفحہ پر
سات رنگوں میں چھپی ہوئی خوبصورت تصویریں
سچے دوست
۴۰ نئے پیسے
ڈرپوک چوہا
۴۰ نئے پیسے
ظالم بلی
۴۰ نئے پیسے
بے وقوف راجہ
۴۰ نئے پیسے
ککڑوں کوں
۴۰ نئے پیسے
یہ ساتوں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر محصول
ڈاک اتنا ہی لگتا ہے جتنا ہر کتاب
علیحدہ علیحدہ منگانے پر
اس لئے ان ساتوں
کتابوں کو ایک ساتھ
منگانے ہی میں فائدہ ہے
کھلونا بک ڈپو نئی دہلی
شیر کا انعام
۴۰ نئے پیسے

نقاروں کی بھاری آواز سے زمین کا کلیجہ ہلا جا رہا تھا قبیلے والوں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیتے تھے آسمان سے نازل ہونے والی بلاؤں کے تصور سے ان کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ جب نقاروں کی بھاری آواز ان کے کانوں میں گونجتی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز جاتے تھے۔

جب بھی قبیلہ کا پجاری نقارے پر بھاری چوٹ مارتا، ان کے ہاتھ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ جاتے۔ نقارے کی گونجتی ہوئی بھیانک آواز اس بات کا پیش خیمہ تھی کہ آسمان سے بلائیں قہر بن کر ٹوٹنے والی ہیں۔ ہواؤں کے چیختے چنگھاڑتے جھونکے موت بن کر ان کے سروں پر چھا جائیں گے۔ آسمان سے بجلیاں گریں گی اور وہ بلبلاتی ہوئی آگ میں جل کر خاک ہو جائیں گے۔ آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ اور پہاڑوں کے بھاری ٹکڑے ہواؤں میں روئی کے گالوں کی طرح بکھر جائیں گے اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

قبیلے کو آسمانی بلاؤں کے غصے سے بچانے کے لئے ہر برس کاہن دیوتا کے بت پر زندہ انسان کا خون چڑھایا جاتا تھا، اور یہ بھیانک رسم قبیلے کا پجاری ادا کرتا تھا۔ ہر برس قبیلے کا کوئی خوب رو نوجوان اس دہشت پسند رسم کی نذر ہو جاتا تھا۔

ہر سال جب بھی نقارے کی آواز گونجتی تھی، قبیلے کے سب لوگ ایک ایک کر کے پجاری کے گرد جمع ہو جاتے تھے ــــ ڈرتے، کانپتے اور لرزتے ہوئے ــــ بوڑھوں کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ ماؤں کے کلیجے شق ہو جاتے تھے۔ اور بہنیں مچھلی کی طرح تڑپنے لگتی تھیں، کسی ماں کا چاند، کسی باپ کی آنکھ کا نور، کسی بہن کا سجیلا بھائی اس خوف ناک رسم کا شکار ہو جاتا ــــ جس کی کوئی داد فریاد نہیں تھی ــــ جنگل کے قانون پر اعتراض کرنے والے کی زبان کاٹ لی جاتی تھی اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گونگا بنا دیا جاتا تھا۔

قبیلے کے پجاری کا نام عاصی تھا۔ وہ اپنے حجرے کے باہر بہت کم نکلتا تھا۔ پھلوں پھولوں کی نذر نیاز اسے باقاعدگی کے ساتھ پہنچا دی جاتی تھی۔ قبیلے کے لوگ بھیڑ کے تازہ دودھ

ے منکیاں بھر کر اس کے حجرے کے باہر رکھ آتے تھے
خرگوش کا بھنا ہوا گوشت اس کی روزانہ کی خوراک میں
شامل تھا۔ قبیلے کے نوجوان ہر روز خرگوش کے شکار کے
لئے نکل جاتے تھے اور جس دن خرگوش کے شکار میں انہیں
ناکامی ہوتی تھی۔ پجاری کے حکم کے مطابق انہیں دہکتے ہوئے
انگاروں پر چلنا پڑتا تھا۔

عاصی کا چہرہ کوڑیالے سانپ کی رنگت کا تھا۔ اس
کی آنکھوں میں آگ کا الاؤ سا جلتا رہتا تھا۔ ناک کی جگہ پر ایک غار
تھا۔ وہ ایک لمبا چغہ پہنے رہتا تھا۔ اس کے گلے میں مردہ
سانپوں کی ہڈیوں سے بنائے ہوئے ہار پڑے رہتے تھے۔

کاہن دیوتا کے بت کو کس کے خون سے نہلایا جائے
اس کا فیصلہ بھی پجاری ہی کے ہاتھ میں تھا ـــــ وہ اپنی
آنکھوں پر کالی پٹی باندھ کر حلقے میں کھڑے ہوئے نوجوانوں
میں سے کسی ایک پر ہاتھ رکھ دیتا۔ قبیلے کے باقی لوگ واپس
اپنے ٹھکانوں پر لوٹ جاتے اور قربانی کے لئے چھانٹے
گئے نوجوان کے خاندان والے روتے پیٹتے۔ اپنے سر پر خاک
ڈالتے مایوس و مجبور واپس چلے جاتے۔

دائرے کی صورت میں سب نوجوان اکٹھا ہوگئے
تھے۔ پجاری نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی۔ نوجوانوں
کے سروں پر موت باز کی طرح جھپٹنے کے لئے اپنے پر
پھیلا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ پجاری آگے بڑھ کر دائرے کی شکل
میں کھڑے ہوئے نوجوانوں میں سے کسی ایک پر ہاتھ رکھتا،
قبیلے کا ایک خوب رو اور بہادر نوجوان جس کی پیشانی پر
سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں نوجوانوں کے مجمع کو چیرتا ہوا
آگے بڑھا اور اس نے خود کو پجاری کے سامنے پیش کر دیا۔

عاصی نے جب پٹی ہٹائی تو اس کی زہریلی آنکھوں میں بجلیاں
کوندنے لگیں۔

"کون، تم ـــــ تم خوش نصیب ہو۔ بہادر تمہاری
بھینٹ سے کاہن دیوتا ضرور خوش ہوں گے۔ اور قبیلے والوں
کے سر سے عذاب کے بادل چھٹ جائیں گے۔ رسم کے
مطابق تمہیں ہمارے مخصوص چشمے میں پہلے غسل کرنا ہوگا۔
ٹھیک آدھی رات کو اور ڈوبتے چاند کی پہلی کرن کے ساتھ
کاہن دیوتا کے بت کے سامنے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جانا۔
دیوتا تمہیں قبول کرلیں گے۔ تمہارے ساتھ قبیلے والوں
کی بھی نجات ہو جائے گی۔

جب صبح کا سورج نئی روشنی لے کر طلوع ہوا تو
لوگوں نے ایک عجیب ماجرا دیکھا۔ کاہن دیوتا کے بت کے
سامنے عاصی اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے نرخرے سے تازہ
تازہ خون بہہ رہا تھا۔ اور خوب رو اور بہادر نوجوان جس
کے چہرے سے علم کی روشنی پھوٹ رہی تھی، قبیلے والوں
سے کہہ رہا تھا۔

"لوگو! اندھیرا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹ گیا ہے۔
اب کبھی آسمانوں سے بلائیں نازل نہ ہوں گی ـــــ آدم خور
پجاری کی آخری قربانی تھی۔ آؤ! دیکھو کہ سینکڑوں انسانی
لاشوں کے ڈھانچے اس گناہ گار اور ظالم پجاری کے حجرے
میں پڑے فریاد کر رہے ہیں۔ جسے ہم لوگ پانی کا چشمہ
سمجھتے آتے تھے۔ وہ شراب کا چشمہ ہے جس میں غوطہ لگانے
کے بعد ہر شخص مدہوش ہو جاتا تھا اور پھر اس بے رحم پجاری
کے جہنم جیسے پیٹ کا ایندھن بن جاتا تھا۔

اور اس کے بعد پھر کبھی کاہن دیوتا کے سامنے زندہ
انسانوں کی قربانی نہیں دی گئی۔

●●

تتلی
کیفؔ مرادآبادی
تتلی ہے کہ شاہکارِ فطرت
گلشن کی فضا میں اُڑ رہا ہے
جیسے کوئی خوبرو پری زاد
اندر کی سبھا میں اُڑ رہا ہے
یا حسن کا کوئی نقشِ فانی
ارمانِ لقا میں اُڑ رہا ہے
یا میرا تصورِ حسین ہے
جو دُور خلا میں اُڑ رہا ہے
اِک پھول ہے شاخِ صندلیں پر
اِک پھول ہوا میں اُڑ رہا ہے
GHAYAS
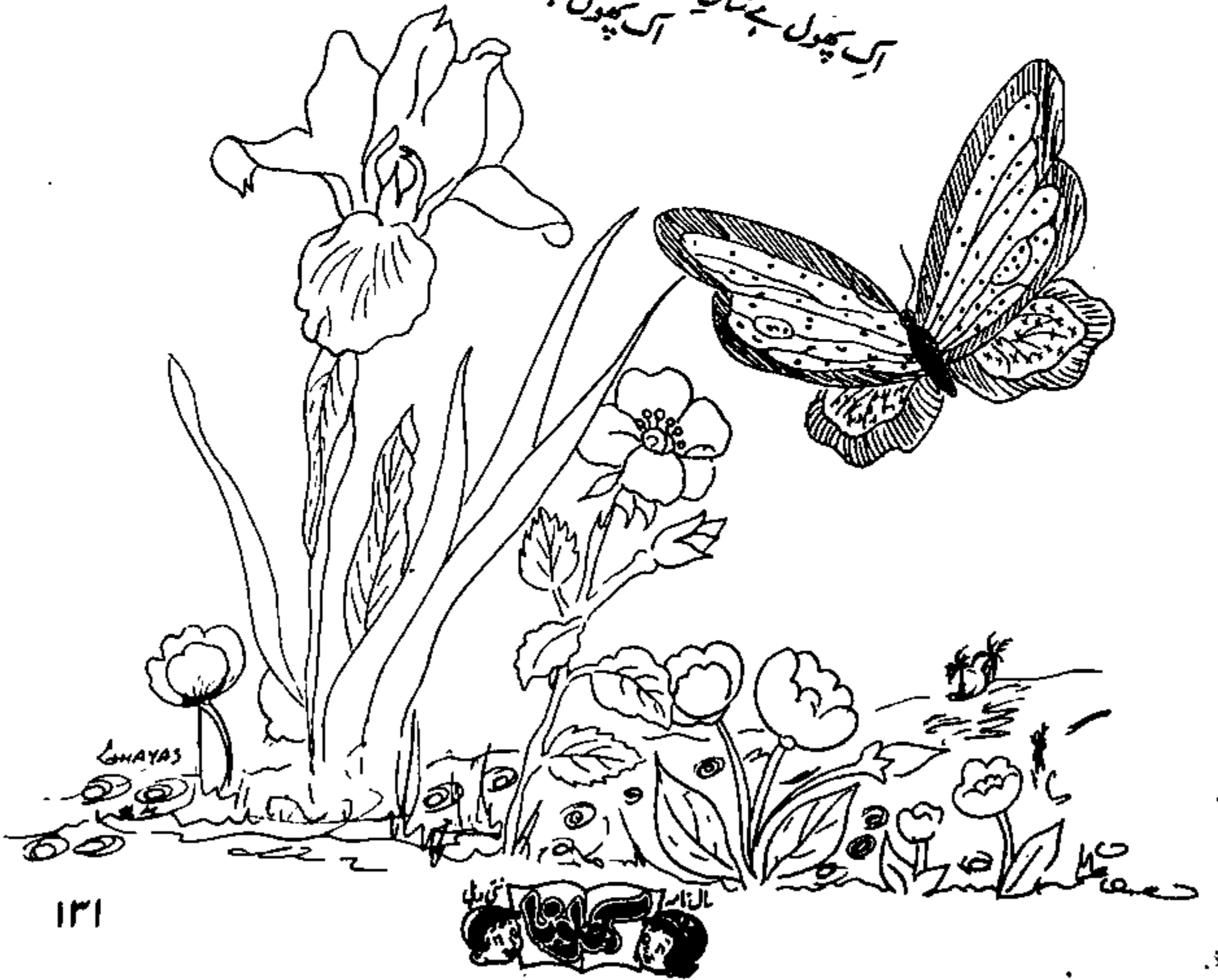
فوجیوں کے قہقہے

اس کے پھیپھڑے تو بالکل ٹھیک ہیں۔

ایک فوجی اور تین ڈینٹسٹ
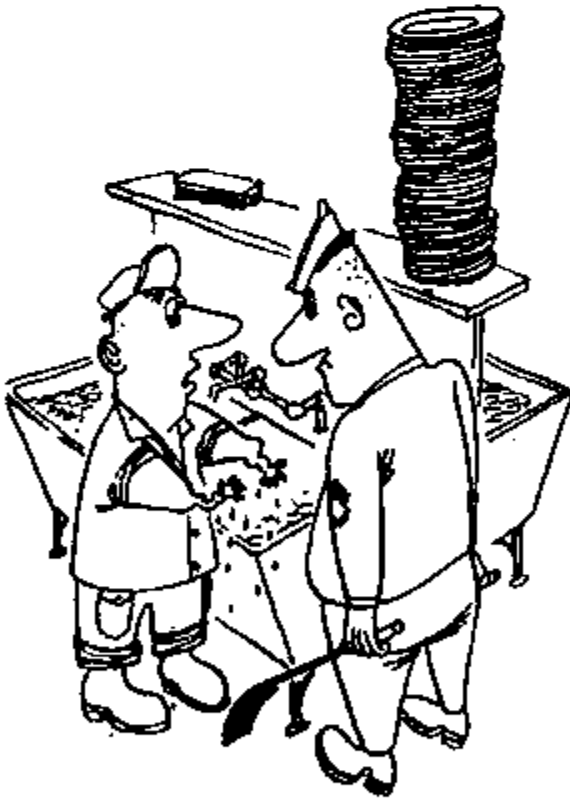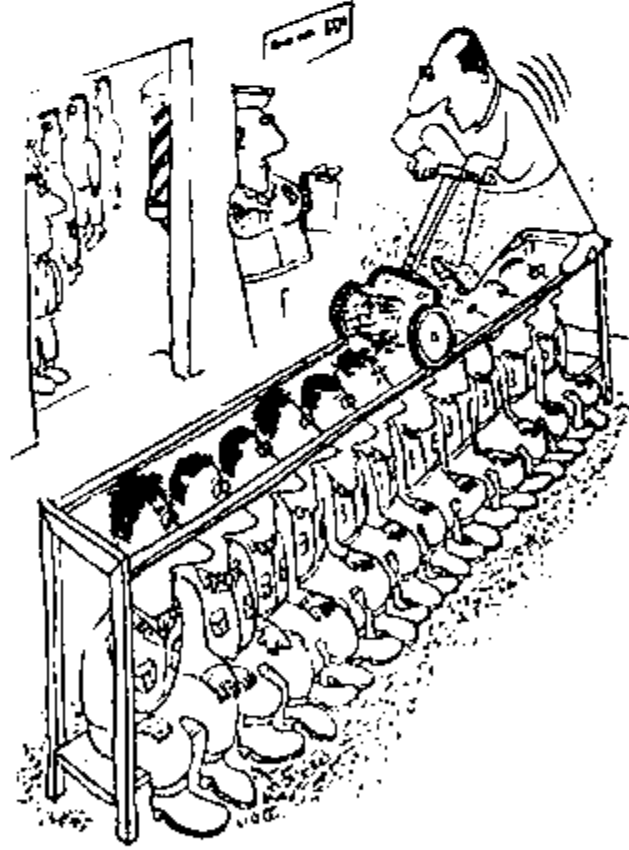
فوجیوں کے بال جلدی کاٹنے کا طریقہ!

جناب برتن دھوتے دھوتے میرے ہاتھوں کا یہ حشر ہو گیا ہے!

عشرت رحمانی

بنگال کا ایک خاص پھل کٹھل ہے۔ یہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ کوئی پھل تو کیا سبزی کی کوئی چیز بھی اس کا مقابلہ نہیں کرتی۔ ایک کٹھل کم سے کم دس بارہ سیر کا ہوتا ہے۔ کھانے میں بے حد میٹھا اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔ لیکن اس کا شیرہ بہت لیس دار ہوتا ہے۔ عام طور پر اسے کھانے کے لئے ایک خاص ترکیب کرنی پڑتی ہے۔ ہاتھوں اور مونہہ اور ہونٹوں پر ناریل کا تیل مل لیا جاتا ہے اس سے ہاتھ اور مونہہ چپکنے سے بچ جاتے ہیں۔ ورنہ اس کے لیس سے نجات ملنا مشکل ہوتا ہے۔

بنگلہ زبان کی ایک دل چسپ کہانی اس پھل کے بارے میں مشہور ہے۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ ایک پٹھان بھائی اپنا کابلی میوہ بیچتے بیچتے بنگال کے کسی شہر میں جا نکلے۔ وہ بازار سے گزر رہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک شخص کٹھل بیچتا ملا۔ خان صاحب نے جو ایسی بھاری بھرکم چیز دیکھی تو پوچھا کہ اس کا کیا کرتے ہیں؟ انہیں بتایا گیا، یہ ایک مزے دار پھل ہے۔ اسے کھاتے ہیں۔ قیمت پوچھی تو معلوم ہوا "پانچ روپے"۔ خان صاحب بہت خوش ہوئے کہ ایسی عمدہ اور بھاری کھانے کی چیز پانچ روپے کی مل رہی ہے۔ پیٹ بھر کر مزے سے کھائیں گے۔ پھر بھی بچ رہے گی۔ انہوں نے جلدی سے پانچ روپے دیئے اور کٹھل اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ چلتے چلتے وہ سڑک کے کنارے ایک جگہ بیٹھ گئے اور اپنا چمک دار لمبا، تیز دھار چاقو نکال کر کٹھل کے ٹکڑے کر کے کھانے لگے۔ وہ تو نرا ہی میٹھا۔ خان صاحب بہت خوش ہوئے۔ جی بھر کے کھایا اور جو بچ رہا اسے رومال میں باندھ کر چلنے کا ارادہ کیا۔ مگر کٹھل کھانے کی ترکیب تو خان صاحب کو کسی نے بتائی نہ تھی۔ ان کے ہاتھ مونہہ اور داڑھی چپک کر رہ گئی۔ انہوں نے ایک نل پر جا کر اپنے ہاتھ اور مونہہ کو دھویا۔ لیکن کٹھل کے لیس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ پانی سے اور زیادہ چپکتا ہے۔ خان صاحب جتنا ہاتھوں اور مونہہ کو دھوتے تھے اتنا ہی اس کے لیس میں چپکتے تھے۔ دیر تک رگڑ رگڑ کر دھونے کے باوجود لیس سے چھٹکارا نہیں ہوا۔

اب تو خان صاحب سخت پریشان ہوئے۔ راستے سے جو بھی راہ گیر گزرا اس سے پوچھنے لگے: "بھائی! بتاؤ میں اپنا مونہہ اور ہاتھ کیسے صاف کروں۔" کسی نے کہا: "صابن سے

دھولو۔ کسی نے کچھ، کسی نے کچھ۔ دراصل ہر ایک کو خان صاحب کا یہ حال یہ دیکھ کر دل لگی سوجھنے لگی تھی اور جس جس نے جو ترکیب بتائی وہ ایسی تھی جس سے لیس صاف ہونے کی بجائے ہاتھ اور مونہہ زیادہ ہی چپکتے تھے۔

ہوتے ہوتے خان صاحب بے چارے کا یہ حال ہوا ہونٹ چپک کر جیسے سل گئے۔ بات کرنی دشوار ہو گیا۔ اور مونچھوں کے بال ایسے چپکے تھے کہ اکڑ کر رہ گئے اور چہرہ جکڑنے سے بے چارے کو سخت تکلیف ہونے لگی۔ خان صاحب اسی حالت میں لوگوں کو اپنا چہرہ دکھاتے اور اشارے سے پوچھتے پھرتے تھے کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پائیں۔

آخر ایک شخص نے ان کو بتایا کہ اس کا آسان علاج یہ ہے کہ آپ اپنی داڑھی منڈوائیں —— خان صاحب نے ایک نائی کے پاس جا کر داڑھی مونچھیں صاف کرائیں اور اس نائی نے ناریل کے تیل سے ان کے ہاتھوں اور مونہہ کو صاف بھی کر دیا۔ پھر اس نے خان صاحب کو کٹھل کھانے کی ترکیب بھی سمجھا دی۔ وہ خوش خوش وہاں سے چل دیئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنا بچا ہوا کٹھل کھا کر پیسے وصول ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

اس کے بعد جب بھی خان صاحب کو ان کے علاقے کا کوئی شخص ملتا۔ اور وہ اس کی داڑھی منڈی ہوئی دیکھتے تو فوراً اسے گلے لگا کر ہنستے ہوئے کہتے: "ہم سمجھ گئے —— تم نے کٹھل کھایا ہے"

وہ شخص حیران ہو کر ان سے کٹھل کا ماجرا دریافت کرتا۔ پھر وہ اسے اپنی ساری کہانی سناتے اور بازار سے جا کر کٹھل خرید لاکر نائی کی بتائی ہوئی ترکیب سے کٹھل کھا کر خوش ہوتے۔

■ ■

چھپے رستم

فریدہ خان

صہبا اپنا نام ہوم ورک کر رہی تھی کہ اس کی کلاس فیلو ناز آگئی اور صہبا کے قریب بیٹھ کر اپنا بیگ کھولتے ہوئے بولی "مس گل نے کل کون کون سے 'کوئسچن' دیے تھے ذرا ڈکٹیٹ تو کروا دو۔ مجھے کل 'کولڈ' ہوگیا تھا اس لئے میں ایبسینٹ رہ گئی۔" صہبا نے اس کی موٹی موٹی اور سفید بانہوں اور ٹانگوں کو دیکھتے ہوئے کہا، اچھا لیکن سردیوں میں یہ تم نے کیسا لباس پہن رکھا ہے۔

"کیا کروں صہبا۔ مجھے شلوار اور سلیوز (آستین) سے بہت چڑ ہے۔ مگر پہلے یہ تو بتاؤ یہ کون ہیں ــ" اور اس نے چوکی پر بیٹھی ہوئی ایک سفید پوش بڑی بی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میری 'گرینڈ ما' ہیں۔"

کتنی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ باغ کی گھاس بہت لمبی ہوگئی ہے کٹوا دو لیکن تمھیں اخبار اور کتابیں پڑھنے سے فرصت ہی نہیں ملی۔

یہ لپس (ہونٹ) کیوں شیک کر رہی ہیں ؟ ـ"
ناز نے پوچھا۔

صہبا ہنسنے لگی "اُف تم اُردو بول رہی ہو یا اس کا گلا گھونٹ رہی ہو۔ یا تو ٹھیک اُردو بولو یا پھر انگلش ہی میں بات کرو۔"

"ممی نے کہا کہ مجھ کو اُردو بھی ٹاک کرنا آنی چاہیئے اس لئے میں آج کل پریکٹیس کر رہی ہوں۔" ہاں تو تم نے کہا ہی نہیں کہ یہ لپس کیوں شیک کر رہی ہیں ؟ ۔

"یہ تسبیح پڑھ رہی ہیں۔"

"کیا ؟" ناز نے جھک کر پوچھا۔

"تُھو ہے تم پر ــــــ" صہبا نے کہا اور پھر انگلش میں جملہ دوہرا دیا۔

"اوہ ! لیکن صہبا تمھاری گرینی (نانی جان) کی آنکھوں سے "ٹیرس" (آنسو) کیوں بہہ رہے ہیں ؟"

صہبا نے پلٹ کر دیکھا۔ واقعی گرینڈ ما کی سُرمہ لگی جھرّیوں پڑی آنکھیں بند تھیں اور پلکوں کے نیچے سے دو دھاریں نیچے کی جانب رواں تھیں۔

"ہیچ !" صہبا نے پریشان ہو کر کہا اور پکارا "گرینڈما" گرینڈ ما !"

مگر گرینڈ ما نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا یہ ڈیف (بہری) ہیں صہبا !" ناز نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں ــ میں 'گرینڈ ما' کہتی ہوں تو یہ کبھی نہیں بولتیں"

"مائی گاڈ ــ کیوں ؟"

"وہ کہتی ہیں نانی جان کہا کرو۔"

"اوہ ! ناز ہنسنے لگی ۔" نینی جُون ۔ کتنا چیپ معلوم ہوتا ہے۔"

صہبا پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ــــــ اور ناز حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

"اُف ! ناز خُدا کے لئے تم مجھ سے انگلش میں بولو ۔ ہائے کیا اُردو بولتی ہو ۔ آتا تو نہ بولو تمھیں نانی جان نہیں کہنا آتا ؟ اِسے بھی تم نے انگریزی لباس پہنا دیا ۔ نینی جُون اُف ۔ اور وہ دُوبارہ ہنستے ہنستے سُرخ ہوگئی "اپنا نام ناز تو کہہ لیتی ہو "نوز" تو نہیں کہتیں ۔ تو کیا نانی جان نہیں کہہ سکتیں ؟ لو یہ میری کاپی اس سے میں سوال اُتار کر کاپی واپس کر دینا ۔ ورنہ میں آج کوئی کام نہ کر سکوں گی ۔ چلو بھاگو۔

ناز کچھ کھسیا کر چلی گئی ۔ نانی جان کی حالت دکھانے کے لئے صہبا جاکر امّی کو بُلا لائی۔

"امّاں ۔ آپ رُو رہی ہیں ۔ کسی نالائق نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ؟" انھوں نے آکر پوچھا۔

"ارے نہیں بی ۔ کسی نے کچھ نہیں کہا ــــ" وہ ایک

گہری سانس لے کر بولیں ۔

"پھر وجہ کیا ہے ؟" آپ اس قدر دل برداشتہ کیوں بیٹھی ہیں ؟"

"یوں ہی ——"

"کہئے بھی ۔ آخر کیا بات ہوئی ذرا نام تو لے دیجئے آپ ۔ ابھی ٹھیک کئے دیتی ہوں ۔" امی نے اپنی پوڈر پر ادھر اُدھر نظر ڈالتے ہوئے کہا ۔

"کوئی ایک ہو تو بولوں ۔ مجھے تو اپنے سب مسلمانوں کی حالت پر رونا آرہا ہے —— تم نے اِن بچوں کو فرنگی سکولوں میں ڈال کر اچھا نہیں کیا ——"

اس کا مطلب ہے اس صہبا کی بچی نے ——"

"نہیں بھئی — صہبا نہیں — میں عام حالت سے نالاں ہوں ۔ ابھی ان کی سہیلی آئی تھیں بات چیت کا انداز خو دبات چیت ، ہرادا دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی تھی نہ ادھر کی رہیں نہ اُدھر کی رہیں ، نہ پوری انگریز لگیں نہ پوری ہندوستانی ۔

"تو ہم کو کیا امی جان — وہ جانیں اور ان کے کام ۔ خدا نخواستہ صہبا سے تو آپ کو شکایت نہیں ۔ آپ دیکھتی ہیں کہ وہ نماز روزے کی تو پابندی کرتی ہے ۔ پھر آپ کو کیا دُکھ ہے ۔" لیکن یہ مثال ہر گھر میں نہیں مل سکتی بچو ۔"

نانی جان ٹھنڈا سانس بھر کر بولیں ۔

اُدھر سے صہبا کے بڑے بھائی ناز کے بڑے بھائی کے ساتھ جھومتے جھامتے کپڑوں کے بڑے بڑے بنڈل لئے طوفانِ بےتمیزی کے ساتھ داخل ہوئے اور بولے "سارے جہان کا درد نانی اماں کے دل میں ہے ۔ دوسروں کی چھوڑیئے اور دیکھئے ہم عید کے لئے کیا کیا لائے ہیں ۔"

جب اچھے اچھے کپڑے نکل کر نگاہوں کے آگے بکھر گئے تو قیمتیں پوچھی جانے لگیں ۔ رائیں دی جانے لگیں ۔

گینڈے سے جان بچانا ہو تو اس درخت پر چڑھ جاؤ

اور کچھ دیر کے لئے محفل گرم سی معلوم ہونے لگی ۔ نانی جان اپنے سنجیدہ انداز میں اپنی پسند ناپسند بڑی صاف گوئی سے بتاتی رہیں ۔ بظاہر تو لگتا تھا کہ ان کا بھولا بھالا دل سارے جہان کے درد سے بےنیاز ہو گیا تھا مگر وقتاً فوقتاً چھوٹتے ہوئے سانس دُکھ کا پتہ دے رہے تھے ۔ امی کپڑوں کی تعداد فہرست سے ملا کر دیکھ رہی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی کپڑا دُکان پر ہی چھوٹ گیا ہو اور فہرست میں خواہ مخواہ نام درج ہو اور دام دئے جا چکے ہوں ۔ مگر لینے کے دینے پڑ گئے ۔ بات برعکس ہوئی ۔ ایک کپڑا زیادہ آگیا تھا جس کا فہرست میں ذکر نہ تھا ۔ دو دو بار امی نے فہرست پڑھوا کر سنی اور بڑی احتیاط سے کپڑے الگ کرتی رہیں —— مگر وہی ایک کپڑا زیادہ ہی نکلا ۔ یہ رافع میاں کی پتلون کا تھا — دو میٹر ۲۲ روپے کا ۔

"ہے ہے یہ تو بہت بُرا ہوا ۔" امی یہ سوچ کر بولیں کہ مزید ۲۲ روپے دینے پڑیں گے :

نانی جان بولیں بُرا کیا ہوا ۔ پیسے بھجوا دو ۔"

ناز کے بھائی جان بولے ہونہہ آپ بھی کیا بھولی ہیں ۔ اللہ میاں نے مفت میں بھیجا ہے کیوں ناشکری

بیماری کا بہانہ نہیں چلے گا۔ ہمیں بہت زور کی بھوک لگی ہے۔

کی جائے؟ اور پھر انھوں نے صہبا کی ناک پکڑ کر سر اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیوں مُلانی بی ——— کیا خیال ہے؟"

"گرینڈ ما ..... نہ نانی جان ٹھیک بولتی ہیں" اور ہماری ٹیکسٹ (درسی کتاب) میں بھی لکھا ہے کہ کسی کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرنی چاہیے۔"

صہبا کے بھائی رشید کچھ سوچتے رہے۔ امی اُن کا مُنہ تکتی رہیں کہ بغیر بے ایمانی کے پیسے بچنے کی سبیل نکل آتے

نانی جان نے بڑے دُکھ اور تعجب سے کہا "حیرت ہے۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے بیٹی؟ خدا کا کچھ خوف ہو تو تذبذب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

ناز کے بھائی حامد بولے " نانی اماں آپ کو یہ سب کچھ آسان معلوم ہوتا ہے لیکن یہاں شرم یہ آ پڑی کہ واپس کیوں کر کریں؟"

"نیک کام میں شرم کیا بیٹا؟"

لوگ بے وقوف سمجھتے ہیں اور کیا؟ خوشی خوشی واپس لینے کو تو لے لیں گے۔ اور ہمارے پیٹھ موڑتے ہی آنکھ مار کر کہیں گے: بڑا سیدھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بڑا گدھا ہے۔ نانی اماں نیکی اب بے وقوفی کا دوسرا نام ہے"

"تو کیا خدا کے نام پر یہ نام منظور نہیں؟ کبھی لوگ جان تک دے ڈالتے تھے۔ بے وقوفی کا خطاب مول لینا کون سا بڑا کام ہے، جب کہ حقیقت وہ نہیں تھوڑی بہت قربانی چاہیے محبت کے اظہار کے لئے"

حامد اور رشید ایک دوسرے کو دیکھ کر یوں ہنسنے لگے گویا کہہ رہے ہوں "اب یہ بوڑھی ہیں۔ پرانے خیالات کی حامی۔ کون سمجھائے"

وہ سمجھ کر کچھ تلخی سے مسکرائیں، کہا "جانتی ہوں سوچ رہے ہو کون اس بڑھیا سے سر کھپائے۔ مگر بیٹا ضروری نہیں کہ ہر وہ بات جو تم نوجوان لڑکوں کی مرضی اور رائے کے خلاف ہو وہ ہم بوڑھوں کے سٹھیائے ہوتے ہونے کا ثبوت ہو ——— خدا نیت کو دیکھتا ہے۔ میرا کہنا یہی ہے

امی نے رشید سے کہا۔ "ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں اماں۔ دے آؤ۔ بلا سے لوگ بے وقوف سمجھیں۔ آخر ضمیر بھی تو کوئی چیز ہے"

رشید اور حامد پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے

امی نے چڑ کر ایک دھول جماتے ہوئے کہا۔ "یہ سولہ سترہ سال کی عمر بڑی نفرت انگیز ہوتی ہے۔ یہ لونڈے اپنے آپ کو نہ جانے کیوں سقراط سمجھنے لگتے ہیں۔ یوں ہنس رہے ہیں کہ چلو ایک مزید بڑی بی کا اضافہ ہوا۔

"توبہ کیجئے امی"

"توبہ آپ کیجئے رشید بھائی۔ نہ کہ امی ——— وہ ٹھیک ہی تو کہتی ہیں" صہبا نے کہا۔

لو یہ تیسری بڑی بی ٹپکیں ———" حامد پھر اُس کی ناک پر جھپٹے۔

پھر دونوں دوست کپڑا اور پیسہ لے کر واپس کرنے چلے گئے۔

آدھ گھنٹے بعد دونوں لوٹ آئے۔

"لیجئے امّی" رشید بولے روپیہ اور کپڑے دونوں واپس ـــــ غلطی اپنی تھی ـــــ میری اور رؤف کی پتلون کا کپڑا ایک جیسا ہے۔ رافع صاحب کا مختلف تھا۔ میں نے سوچا کہ الگ سے لکھا ہوگا۔ تو دراصل ہماری ہی پتلونوں کے کپڑوں میں ملاکر لکھ دیا تھا۔ یہ دکاندار نے بتایا۔ ہم لوگوں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ میری اور رؤف کی پتلون کا کپڑا بھلا سات گز کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ قاعدے سے ساڑھے چار گز ہی ہونا چاہئے تھا اور قیمت بھی پچاس پچپن کو چھوڑ کر پچھتر اسّی کیوں کر ہوگی ـــــ دکاندار بڑا نیک نکلا۔

"اور گدھا نہیں؟" نانی جان مسکرا کر بولیں۔

تھوڑی دیر بعد صہبا اپنی آنکھیں پھیلائے اپنی امّی سے کہہ رہی تھی۔ "نانی جان نے کتنا سچ کہا تھا امّی۔ سچ مچ اللہ اپنا امتحان لے رہا تھا نا؟"

"ہاں"

"اور فرض کیجئے اگر ہم یہ سوچ کر چپ ہو جاتے کہ چلو دکاندار کی غلطی کو کوئی کیا کرے۔ تب ہماری بُری نیت کے بارے میں اللہ کیا سوچتا کہ دیکھو کیسے کنجوس اور بے ایمان لوگ ہیں؟"

"ہاں۔ بالکل" امّی محبت سے مسکرا کر بولیں۔

"امّی میں سمجھتی تھی کہ بوڑھے لوگ واقعی بہت ـــــ میرا مطلب ـــــ عقلمند نہیں ہوتے ـــــ یہ مجھے ناز کی بچی نے سکھایا تھا۔ کہتی تھی کہ بڑھاپا بہت ہی بڑا دور ہے، جس میں انسان پھر بچہ بن جاتا ہے۔ اس لئے تو میں نانی اماں

میں آپ سے تلوار بازی کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔

کی باتوں کو ٹال جاتی تھی۔ آئندہ کبھی ایسا نہ کروں گی۔ خدا کرے کہ وہ مجھے اسی وقت کوئی کام بتا دیں ـــــ" صہبا باتیں کرتی ہوئی نانی جان کی آواز کا انتظار کرنے لگی۔ مگر جب کوئی آواز نہ آئی تو اُس نے خود آواز دی۔

"نانی جان"

انھوں نے مسکرا کر کہا "آج گرینڈما نہیں کہوگی؟"

"آپ کو ناپسند ہے نا؟"

"اچھا کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"کچھ کام بتائیے"

"بس یہ عہد کرو کہ میں اپنی گرینڈما کی سچ مچ گرینڈ رہوں گی۔ اگر گرینڈ ڈاٹر بن جاؤں" وہ ہنس کر بولیں اور صہبا مونہہ کھولے تعجب کرتی رہی کہ یہ بوڑھے بھی بڑے چھپے رستم ہوتے ہیں ـــــ کتنے اچھے ہوتے ہیں یہ بوڑھے! ●●

بارہ پتّیاں

ان پتیوں کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ ان میں کون کون سی
پتیاں ایک جیسی ہیں؟

جواب صفحہ ۱۶۰ پر دیکھو

کھلنڈروں کی قوالی

عفت فاطمہ عثمانی

جی پڑھائی سے چرائیں تو کوئی بات بنے
روز اسکول نہ جائیں تو کوئی بات بنے

جو پڑھاتے ہیں کتابیں ہمیں اک دن، ہم بھی
اُن کو پٹی جو پڑھائیں تو کوئی بات بنے

دل میں . دل سے تمنا ہے ہمارے کہ کبھی
ماسٹر جی کو ستائیں تو کوئی بات بنے

جو بنا دیتے ہیں مُرغا ہمیں، ہم بھی اُن کا
کارٹون ایک بنائیں تو کوئی بات بنے

ڈانٹ جو روز پلاتے ہیں یہ کہہ دو اُن سے
کوکا کولا بھی پلائیں تو کوئی بات بنے

روز آنکھیں ہی دِکھانا تو کوئی ٹھیک نہیں
فلم بھی ہم کو دکھائیں تو کوئی بات بنے

مار کھانے کا کوئی غم نہیں شکوہ یہ ہے
کبھی حلوا بھی کھلائیں تو کوئی بات بنے

روز پڑھنے سے کوئی بات نہیں بنتی ہے
کبھی پکنک بھی منائیں تو کوئی بات بنے

اور پڑھانا ہی اگر ہے تو گزارش یہ ہے
ارتھمیٹک نہ پڑھائیں تو کوئی بات بنے

JAGDISH KANNA

بھیڑ کے بچّے
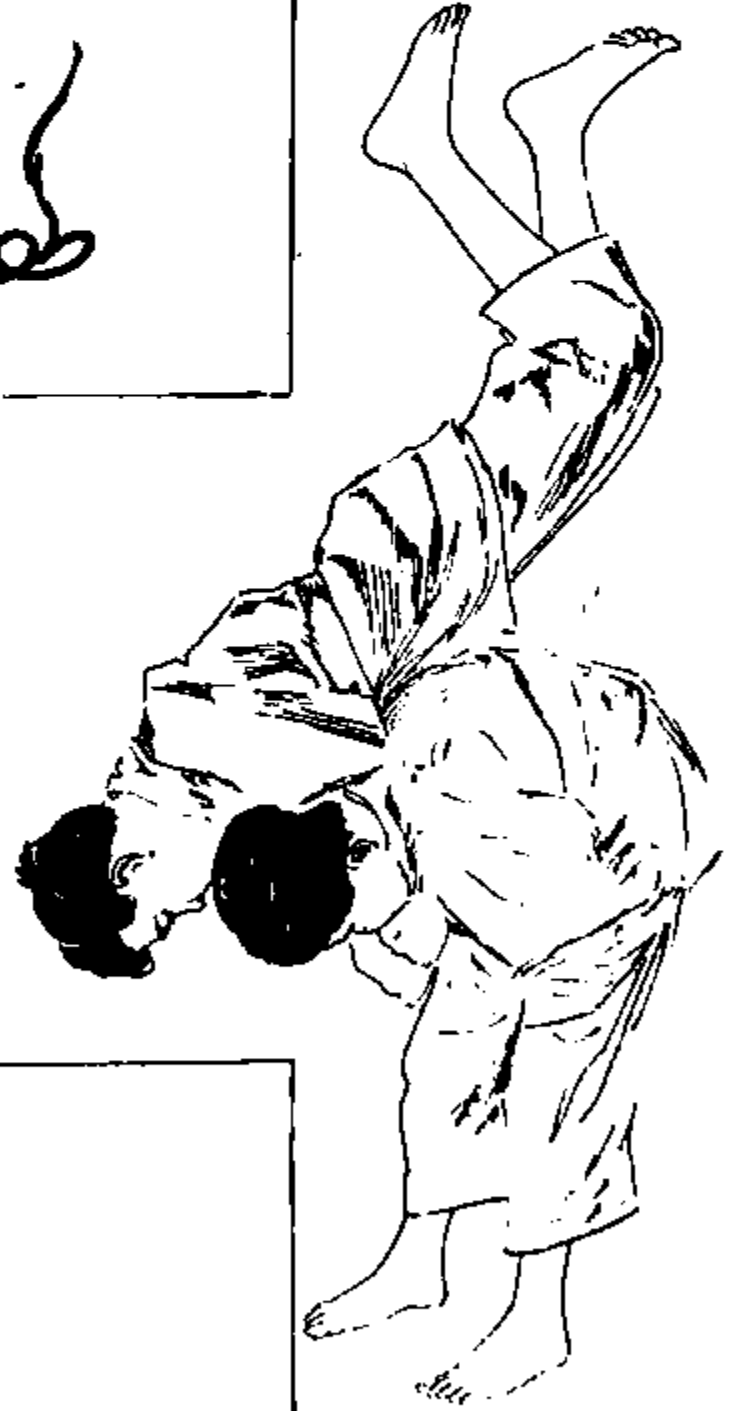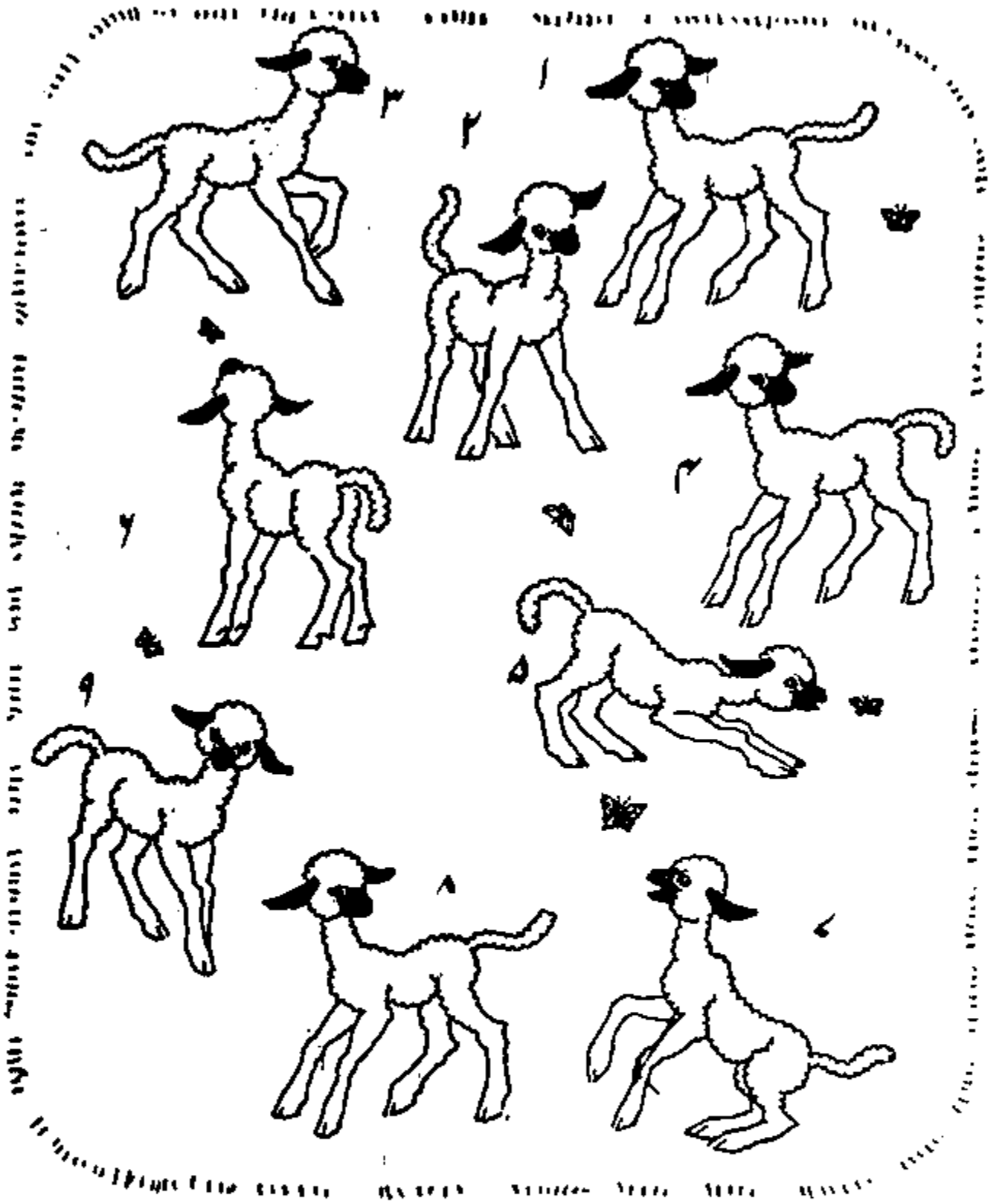
یہ بھیڑ کے بچّے دیکھنے میں ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں لیکن تم اگر انھیں غور سے دیکھو تو صرف دو ایک جیسے ہیں بتاؤ وہ کون سے ہیں ——— ؟

جواب صفحہ ۱۶۰ پر دیکھیے۔

پاپا کے نام بچوں کا خط

رام لال

ڈیر پاپا!

نیا سال مبارک ہو۔ آپ یہ خط دیکھ کر حیران ہو رہے ہوں گے کہ ہماری بجائے (یعنی رجّو، ٹونی اور میری جگہ) ممّی صرف ہمارا خط لے کر لوٹ رہی ہیں۔ ہمارا خیال ہے آپ کو حیرت ہی ہوگی، مایوسی ہرگز نہ ہوگی، مایوسی تو آپ کو کبھی ہوتی ہی نہیں ہے۔ پاپا، یہ بات ہم طنز کی خاطر نہیں بلکہ کہہ رہے ہیں، کیونکہ اپنے پاپا پر طنز کرنا ہمیں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ رجّو اور ٹونی کا بھی یہی خیال ہے۔ مایوسی تو ہمیں ہو رہی ہے۔ آپ کو اپنے انتظار میں پلیٹ فارم پر دیکھنے کے لئے ہم کتنی ہی دیر پہلے سے کھڑکی سے لگ کر کھڑے ہو جاتے۔ کھڑکی کے شیشے سے اپنے چہرے چپکائے رہتے۔ اور جب آپ کو دیکھ لیتے تو کتنے زور سے "پاپا پاپا" پکار اُٹھتے۔ اور پھر جب آپ لپک کر ہمارے قریب آتے اور ہمیں ایک ساتھ لپٹا کر پیار کرتے تو ہم کس قدر خوش ہو جاتے! اب ایسا نہیں ہوگا۔ ہم کتنی بڑی خوشی سے محروم ہو گئے ہیں!

لیکن ہم نے اس بار خود ہی اس مایوسی اور محرومی کو چُنا ہے۔ یہ بات پڑھ کر آپ پھر حیران ہو رہے ہوں گے، اور شاید خط پڑھنا چھوڑ کر ممّی سے اچانک پوچھ بھی بیٹھے ہوں گے ——— "کیا بات ہو گئی سُرنا! میرے بچے مجھ سے کیوں ناراض ہو گئے؟"

لیکن پاپا، ہم نے ممّی سے کہہ دیا ہے کہ وہ گاڑی سے اترتے ہی پہلے بس یہ خط آپ کے ہاتھ میں تھما دیں۔ آپ کو فوراً یہ نہ بتائیں کہ ہم

ارے ـــــ یہ کہیں ہمارے جہاز کا پائلٹ نہ ہو ـــــ

اُن کے ساتھ نانا جی کے گھر سے واپس کیوں نہیں آئے؟ آپ پوچھیں تو بھی وہ اپنے منہ سے کچھ نہ بتائیں۔ بس یہی کہہ دیں "پہلے بچوں کا خط پڑھ لیجئے" ہمیں پوری امید ہے کہ نے ہمارے ساتھ کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کیا ہوگا' اور آپ ساری بات جاننے کے لئے اس خط کو پورا پڑھنے کے لئے مجبور ہوگئے ہوں گے۔

اچھا اب ہمارا خط آگے پڑھئے۔

چھٹیوں میں ہم نے نانا جی کے گھر میں خوب عیشیں کئے ہیں۔ کئی بار پکنک منائی ہے۔ چڑیا گھر دیکھا ہے۔ چڑیا گھر میں اب تو بہت سے نئے جانور آگئے ہیں۔ ہم وہ سب دیکھ چکے ہیں۔ مچھلیوں کا گھر بھی دیکھا ہے۔ آج کل سرکس بھی آیا ہوا ہے۔ ہم وہاں بھی گئے تھے۔ بچوں کا عجائب گھر بھی اب پہلے سے زیادہ دلچسپ ہوگیا ہے کیونکہ یہاں ایک بچوں کی ریل بھی چلا دی گئی ہے۔ اور ہاں بال میلے میں اس بار ہم نے ایک ڈرامے میں بھی حصہ لیا تھا جس کا ہمیں انعام بھی ملا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارا دل یہاں اس قدر لگ گیا ہے کہ ہم اسی وجہ سے یہاں سے واپس آنا نہیں چاہتے۔ نہیں بابا، یہ بات ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے واپس نہ آنے کی اصلی وجہ اور ہے۔ چھٹیوں کے بعد تو سب بچے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں چاہے ان چھٹیوں میں وہ کتنی ہی اچھی جگہوں پر کیوں نہ چلے گئے ہوں۔ ہم بھی اتنی اچھی چھٹیاں گذارنے کے بعد اپنے گھر واپس جانے کے لئے بہت ہی بے چین رہے ہیں، لیکن اب ہم نے اچانک واپس جانے کا پروگرام بدل لیا ہے۔ پروگرام میں اچانک تبدیلی پر پہلے تو ممی بہت ناراض ہوئیں لیکن جب انہیں اس کی وجہ معلوم ہوئی تو اُن کی ناراضگی دور ہوگئی اور انہوں نے ہمیں اپنی بات پر اَڑے رہنے کی اجازت دے دی۔ نانا جی بھی ہمارا ارادہ معلوم کر کے بہت خوش ہوئے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اب ہم یہاں سے کبھی واپس ہی نہ جائیں بلکہ ہمیشہ اُن ہی کے ساتھ رہیں۔ ہمیں اُن کی اس تجویز پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے لیکن ہم یہاں رہنے لگیں گے تو اپنے گھر کی کئی اچھی اچھی چیزوں سے دور ہو جائیں گے ـــــ اپنے پیارے پیارے خرگوشوں سے جن کے نام بھی ہم نے کتنے پیارے پیارے رکھ چھوڑے ہیں! لکی، مانرو، بنٹو اور سگرا۔ وہ ہمارے ساتھ کھیل کر کتنے خوش ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں بسکٹ کھاتے ہیں۔ دودھ پیتے ہیں۔ پھل کھاتے ہیں۔ کبھی کبھی شرارتیں بھی کرتے ہیں تو مار بھی کھاتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے ہماری کتابیں کتر ڈالی تھیں تو ہم نے سب کے خوب کان کھینچے تھے۔ پھر جب انہوں نے کان جوڑ کر معافی مانگی تھی تب ہم نے انہیں معاف کیا تھا۔ اور ہاں ہمارا جیکی بھی ہمارے بغیر بہت اداس ہو جائے گا۔ جب ہم اسکول کی بس سے اُترتے ہیں تو وہ کیسے اُچھل اُچھل کر ہم سے ملنے کے لئے گھر سے باہر آجاتا ہے۔ ہمارے کچھ دوست جو پڑوس میں رہتے ہیں ـــــ نول اور ساجد اور پنی ـــــ سب ہمیں بہت یاد آئیں گے۔ اس وقت بھی وہ یاد آرہے ہیں۔ اور دو دوست جو ہر اتوار کو ملنے کے لئے آتے ہیں اور کبھی کبھی ہم بھی اُن سے ملنے کے لئے چلے جاتے ہیں ـــــ یعنی کنو اور منٹو ـــــ ان کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً ہم نے

پچھلے سال اپنے گملوں میں جو پھول اُگائے تھے اور اُنہیں ہر روز پانی بھی دیتے تھے۔ اور بارشوں میں جب ہم اوپر کی برساتی میں جاکر گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ نظارہ کتنا خوب صورت ہوتا ہے ہم تو ہر سال بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کیا کرتے ہیں لیکن یہ سب چیزیں اچھے ساتھیوں کی طرح ہم سے بچھڑ جائیں گی۔

لیکن پاپا آپ کو معلوم ہے اس کے لئے کون ذمّہ دار ہے؟ یقیناً آپ کو کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔ آپ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟

اچھا اب آپ اجازت دیجئے تو ہم اُس کا نام بتا دیں۔ سُنیئے ـــــ وہ آپ ہی تو ہیں پاپا! یہ سُن کر آپ پھر حیران ہو گئے ہوں گے۔ سوچ رہے ہوں گے "بھلا میں کیسے ذمّہ دار ہو سکتا ہوں؟" ممّی سے بھی کہہ رہے ہوں گے ـــــ "سُنا؟ بچّوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ـــــ مجھے کیوں الزام دے رہے ہیں؟ میں نے ہی تو انہیں خرگوش لاکر دیئے۔ ان کے لئے جگنی لے کر آیا۔ اُن کو پھول لگانے کا شوق دِلایا۔ ان کو اچھے اچھے کپڑے پہننے کے لئے دیئے، اور اُن کے دوستوں کے آنے جانے پر کبھی کوئی روک ٹوک نہیں لگائی۔ پھر میں نے اُن سے یہ کب کہا کہ وہ یہاں نہ رہیں!"

لیکن ممّی آپ کو کچھ نہیں بتائیں گی۔ ساری بات ہم ہی بتائیں گے۔ یہ خط پورا پڑھ تو لیجئے۔

سب سے پہلے تو آپ کو ہم یہ بات صاف صاف بتا دیں کہ بچّوں کے لئے خرگوش، کُتّا، پھول، کپڑے، دوست اور خوب صورت گھر ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بچّے ان کے علاوہ بھی کچھ چاہتے ہیں۔ ممّی اور پاپا ان کے لئے سب سے اہم ہوتے ہیں۔ ممّی کا پیار تو ہمیں ملا ہوا ہے۔ آپ بھی ہمیں پیار کرتے ہیں ـــــ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے۔ لیکن کبھی کبھی آپ ہمیں بالکل بھلا بھی دیتے ہیں۔ ہمیں صرف اسی بات کا دُکھ ہے۔ اب آپ اور زیادہ حیران ہو رہے ہوں گے اور سوچتے ہوں گے "میں نے کب تم لوگوں کو بھلایا ہے؟ یہ تو سراسر جھوٹا الزام ہے!"

بلی اور چوہے کا مقابلہ!

پاپا، اب آپ کو یاد دلا ہی دیا جائے کہ آپ نے کس کس موقع پر ہمیں بالکل بھلا دیا تھا، بلکہ ہم سے بالکل تعلق ہی توڑ لیا تھا، جیسے ہم آپ کے کچھ بھی نہیں۔

۱۶ جنوری کو آپ ہمیں پکنک پر لے کر جانے والے تھے۔ لیکن ـــــ؟

۲۶ جنوری کو آپ ہمیں یومِ جمہوریہ کی فوجی پریڈ دِکھانے والے تھے۔ لیکن ـــــ؟

یکم مارچ کو آپ نے ہم سب کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ لیکن ـــــ؟

۱۵ اگست کو آپ نے کہا تھا راج بھون میں آزادی کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ ضرور دیکھنے چلیں گے لیکن ـــــ؟

فہرست بہت لمبی ہے۔ کہاں تک گِنائیں؟ اب ذرا ہماری مایوسی کی وجہ بھی جان لیجئے۔ صرف ایک ہی وجہ ـــــ آپ کے وہ بور دوست جو ہر موقع پر اچانک نازل ہو گئے۔ اور نازل ہونے کے بعد اُنہوں نے ہمیں اچھے کپڑے پہنے دیکھ کر بھی یہ پوچھنے

کی تکلیف گوارا نہ کی —— "کیا آپ لوگ کہیں باہر جا رہے تھے ؟" کبھی نہیں۔ جھوٹ موٹ بھی نہیں۔ وہ جب بھی آئے تو بس گھنٹوں کے لئے جم گئے۔ تاش، شطرنج، دُنیا بھر کی گپیں، بے سر پیر کی باتیں۔ ہم آپ کو یاد دلانے کے لئے پردہ اُٹھا کر جھانک لیتے، تو آپ جھٹ ڈانٹ پلا دیتے، "تم لوگ باہر جا کر کھیلو!" یا کبھی بہت پیار آیا تو اندر بُلا کر اپنے دوستوں سے یہ کہہ دیا —— "دیکھا میرے بچے کتنے اچھے ہیں! ابھی آپ سب کو چائے پلوائیں گے۔"

یہ سُنتے ہی آپ کے دوست قہقہے لگا کر آسمان سر پہ اُٹھا لیتے۔

ہم بے چارے اس اُمید پہ ممی کے کچن اور آپ کے ڈرائنگ رُوم کے درمیان بھاگ کر آتے جاتے رہتے کہ چائے پینے کے بعد آپ کے دوست چلے جائیں گے۔ لیکن —— ؟

پاپا، ہمارے آپ سے ناراض ہونے کی ساری وجہ یہی ہے۔ ہم اب گھر واپس نہیں آئیں گے جب تک آپ اپنے بور دوستوں سے پیچھا نہیں چھڑا لیتے۔ ہم نانا جی کے پاس ہی رہیں گے۔

اچھا گڈ بائی پاپا!

ہمارے جیکی، لکی، مانو، بنٹو اور سگرا کو بھی گڈ بائی!

گھر کی ساری ہی اچھی اچھی اور خوب صورت چیزوں کو بھی گڈ بائی!

آپ کے اپنے
اُداس اُداس بچے
پنٹو
رجو
ٹونی
(نانا جی کے گھر سے)

تصویر میں اس انگریز لڑکی کے کپڑے ایک جیسے معلوم دیتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھو تو سب میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہے۔ اپنا جواب اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے جواب سے ملاؤ۔

میرا اسکول

سعادت نظیر

میرا اسکول سب سے بہتر ہے — کتنا پیارا یہ علم کا گھر ہے!
موہنی ہے یہاں کی رعنائی — زندگی لے رہی ہے انگڑائی
یہ عمارت، یہ باغ، یہ میداں — یہ کتب خانہ، یہ ہنر کا جہاں
پھول سے چہرے اس میں ملتے ہیں — آرزو کے گلاب کھلتے ہیں
کس قدر ہونہار بچے ہیں! — جھوٹے موتی نہیں یہ سچے ہیں
کوئی "ٹیگور" ہے، کوئی "اقبال" — کیا کہوں؟ کیسے کیسے ہیں یہ لال؟
وقت کیا چیز ہے؟ یہ جانتے ہیں — سچی باتوں کو دل سے مانتے ہیں
ان کے جوہر نکھرتے جاتے ہیں — نقش کیا کیا اُبھرتے جاتے ہیں!
ان کے اُستاد جو ہیں، دانا ہیں — اپنے اپنے ہنر میں یکتا ہیں
ڈھنگ جینے کا جو سکھاتے ہیں — "زندگی کیا ہے؟ وہ بتاتے ہیں
"یہ فضا کیا ہے؟ یہ جہاں کیا ہے؟ — یہ زمیں کیا ہے؟ آسماں کیا ہے؟"
یہ سبھا میرے ہونہاروں کی — خوش نما بزم ہے ستاروں کی
کل یہی ہوں گے قوم کے معمار — ہر اندھیرے میں روشنی کے مینار

جو بھی ان میں ہے، وہ مرا دل ہے
اپنی محفل میں شمعِ محفل ہے

پانچ آدمی

یہ پانچ آدمی سڑک پر جا رہے تھے کہ اچانک بڑے زور کی ہوا چلی اور پانچوں کی ٹوپیاں اُڑ گئیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کون سی ٹوپی کس کی ہے؟ ——— صحیح جواب صفحہ ۱۶۰ پر دیکھو

میاں مٹھو

رام پال

نام تو شاید اُن کا کچھ اور تھا، لیکن کہتے سب انھیں میاں مٹھو تھے، کیوں کہ وہ کام بہت کم کرتے تھے، اور باتیں بہت زیادہ۔ گرمیوں میں درخت کے سائے میں بیٹھے دنیا بھر کی اوٹ پٹانگ باتیں کرنا اور سردیوں میں کُھلی دھوپ میں آرام سے پاؤں پسار کے اِدھر اُدھر کی ہانکنا۔ ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اگر کبھی کوئی کام کو کہہ دیتا تو اینٹھ جاتے۔ "واہ صاحب کام کو تو عمر پڑی ہے۔ ابھی سے بوجھ لاد لیا تو زندگی کب تک چلے گی۔" اور اگر کبھی کسی نے زبردستی کی بھی تو ایسا کام کر کے دیا کہ دوسرا عمر بھر اِن سے کام کو تو کہنے سے رہا۔

میاں مٹھو کے ابا کا نام میاں ہمت تھا۔ صبح سے شام تک وہ کام میں لگے رہتے۔ زمین کو جوتنا، بونا، نلائی کرنا، سینچنا، گائے، بھینس، بیلوں کی دیکھ بھال، دودھ، ترکاری، غلہ وغیرہ منڈی میں لے جانا ___ کوئی کام ایسا نہ تھا جو اُن کے سر نہ ہو۔ پھر چونکہ مٹھو کی ماں اِن کی پیدائش پر ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں، اس لئے اپنے اور مٹھو کے لئے روٹی بھی وہی پکاتے تھے ___ میاں مٹھو بس کھانے کے وقت آ موجود ہوتے، اور بجائے ابا میاں

کی مدد کرنے کے، ہر چیز میں سو نقص نکالتے۔ دال میں نمک زیادہ ہے۔ روٹی جل گئی ہے۔ چاول کچے ہیں۔ دودھ پوری طرح اُبلا نہیں۔ اور پھر —— میرا بستر ٹھیک نہیں بچھا۔ کپڑے نہیں دُھلے۔ گھر میں صفائی نہیں —— اور اگر کبھی میاں ہمت نے کہہ دیا، "بیٹا! تو میرا ہاتھ بٹایا کر" تو لگے صلواتیں سُنانے۔ "میں کوئی اس گھر کا نوکر ہوں۔"

آخر تنگ آکر ابا میاں نے انھیں پاس کے ایک قصبے میں پڑھنے بھیج دیا۔ خیال تھا شاید پڑھ لکھ کر سدھر جائیں۔ اور میاں مٹھو کو بھی یہ زعم تھا کہ وہ نہ صرف بہت کام کرنے والے ہیں۔ بلکہ بہت عقل مند بھی ہیں۔ اس لئے انھوں نے ابا سے جاتے وقت کہا۔ ابا میاں، آپ نے تو ہماری قدر نہیں کی۔ ماسٹر جی سے پوچھنا کہ ہم پڑھنے میں کس قدر ہوشیار اور کام کرنے میں کتنے ماہر ہیں۔"

میاں ہمت نے ہنس کر کہا "بیٹا میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تو پڑھنے میں ہوشیار اور کام میں ماہر ہو جائے۔" اور پھر تھوڑی دیر چُپ رہنے کے بعد بولے "بیٹا۔ میں تو باپ تھا۔ تم نے جو کچھ کیا، جو کچھ کہا، درگذر کیا۔ کہہ سن کے چُپ ہو گیا۔ لیکن دنیا میں جب تک کچھ کر دکھاؤ گے نہیں، کچھ بنو گے نہیں۔ کام کی قدر ہوتی ہے، چام کی نہیں۔"

"اونہہ" میاں مٹھو نے مونہہ بنایا۔ "ابا۔ آپ کو خود ہی چند دن میں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا ہیں۔"

اور وہی بات ہوئی۔

جس اسکول میں میاں مٹھو داخل ہوئے اس کے ماسٹر صاحب کا نام تھا منشی ہمت علی۔ وہ میاں مٹھو کے ابا کے رشتے دار بھی تھے اور دوست بھی۔ وہ علاقے بھر میں بہت مشہور تھے کہ ان کے شاگرد آج کل بڑے بڑے عہدوں پر تعینات ہیں۔ کیوں کہ وہ بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ لیکن کام چوروں کے لئے وہ قہر تھے۔ قمچی سے بھی کام لیتے تھے، اور گھورتے ڈانٹتے بھی تھے۔ جو یہ سہہ گئے وہ تو بن گئے۔ اور باقی کے بارے میں آپ جانتے ہی ہیں کہ ان کی زندگی کیسی رہتی ہوگی۔

میاں مٹھو کی مصیبت آگئی وہ صرف باتیں کر سکتے تھے۔ دوسروں کی باتیں بھلا کیسے سُنتے۔ اور پھر لکھنے پڑھنے کا تو ذکر ہی کیا۔ اس میں تو جان توڑ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور مٹھو جی کو محنت اور کام کے نام سے چِڑ تھی۔ منشی ہمت علی انھیں تڑکے چار بجے جگا دیتے۔ کہتے "بیٹا، اٹھو۔ نہا دھو کر جلد فارغ ہو لو اور کتاب، سلیٹ، پنسل لے کر بیٹھو۔"

میاں مٹھو ایسی مٹی کے بنے ہوئے کہاں تھے۔ کچھ دن تو انھوں نے رو دھو کے کاٹ لئے، لیکن ہڈیوں میں تو سُستی رچی تھی۔ بھلا تمام دن پڑھائی کے جوئے تلے کیسے رہتے۔ آخر ایک دن انھوں نے ماسٹر صاحب سے صاف کہہ دیا کہ پڑھنا لکھنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ تو کوئی کام کریں گے۔ اور یہ بتا کر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

چلنے پھرنے کی مٹھو میاں کو زیادہ مشق نہ تھی۔ جاتے کہاں؟ آخر راستے میں ایک ٹرک جاتا ملا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا۔ باتیں بنانا تو خوب آتی تھیں۔ انھوں نے اپنی بپتا کی کہانی ڈرائیور کو اس انداز سے سُنائی کہ اُسے ان پر رحم آگیا۔ اُس نے کہا "بیٹا، چل۔ تو میرے پاس کلینر کا کام کر۔"

میاں مٹھو نے سوچا "چلو۔ کام بن گیا۔ ٹرک میں بیٹھ کر دیس بھر میں گھوما کریں گے۔ اور روٹی جہاں ڈرائیور کھائے گا، ہمیں دے ہی دے گا۔"

وہ فوراً اُچک کر ٹرک میں سوار ہو گئے۔ کچھ میل چلنے کے بعد ٹرک ڈرائیور نے ٹرک روکا۔ اور اُن سے کہا،

دیکھو یہ بالٹی لو اور اُس کنوئیں سے پانی بھر لاؤ انجن میں ڈالنا ہے۔ اور پھر ایک میلا کپڑا لے کر اس کی باڈی صاف کر دو۔"

میاں مٹھو کو یہ پتہ نہ تھا کہ یہاں کام کر کے روٹی ملے گی۔ خیر، چار و ناچار بالٹی اُٹھالی اور کسی طرح بھر بھی لائے۔ آتے ہی انھوں نے بالٹی کا پانی انجن پر اُلٹ دیا۔ ٹرک ڈرائیور نے جب یہ حال دیکھا تو ان کے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ میاں مٹھو لگے رونے۔ پاس سے گذرتے ہوئے ایک ٹرک کے ڈرائیور نے کہا "کیا بات ہے سردار ہمت سنگھ؟ یہ لڑکا کیوں رو رہا ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتا، میاں مٹھو نے حیران ہو کر اپنے آپ سے کہا، "لو بھئی، یہ بھی ہمت ہی ہیں۔ اس ہمت سے ہماری جان نہیں چھوٹتی۔" اور پھر بھاگ کھڑے ہوئے اور اونچی اونچی آوازیں کہنے لگے، "اب میں وہاں جاؤں گا، جہاں ہمت کا نام نہ ہوگا، نہ ہمت کی ضرورت ہوگی۔"

اس کے بعد وہ لگے قریب کے شہر میں گھومنے لیکن کب تک؟ جب بھوک لگی تو ایک دوکان پر جا کھڑے ہوئے اور ہاتھ پھیلا دیا۔ لالہ جی دوکان پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے گھور کر میاں مٹھو کو دیکھا اور کہا "اچھے بھلے ہو۔ کچھ کام کرو۔ مانگتے کیا اچھے لگتے ہو۔"

میاں مٹھو نے مُسمسی صورت بنا کر جواب دیا "کام کرنے کو جی تو بہت چاہتا ہے۔ لیکن کیا کریں کام ملتا ہی نہیں۔"

"کام کیوں نہیں۔ چلو اسی دوکان پہ کام کرنے لگو۔" لالہ جی نے کہا۔

میاں مٹھو نے دیکھا کہ پھل فروٹ کی دوکان ہے کیلے، سنترے، مالٹا، خشک میوے، مونگ پھلی، چلغوزے، کاجو، سجے ہوئے ہیں۔ مونہہ میں پانی بھر آیا۔ لالہ جی نے کہا۔ "دیکھو۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ کوئی آوارہ لڑکا یا جانور آئے تو اسے بھگا دینا۔"

یہ کام بہت آسان تھا۔ میاں مٹھو آرام سے بیٹھ گئے۔ شام تک بیسیوں لڑکوں سے لڑے۔ کئی جانوروں کی وہیں بیٹھے بیٹھے خبر لے ڈالی۔ لالہ جی بھی ان سے خوش ہو گئے شام کو پیٹ بھر کے کھانا دیا اور کہا دوکان ہی میں سو جانا۔"

میاں مٹھو نے سوچا، اب کام بنا، اور دوکان کے اندر لیٹے لیٹے لگے ہوائی قلعے بنانے۔ یہ ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ میاں مٹھو کے شیخ چلی دماغ نے رات گئے تک اپنی الگ پھلوں کی دوکان بنا ڈالی۔ ایک مکان۔ شہر میں عزت۔ گھوڑا گاڑی۔ کپڑے لتے۔ نوکر چاکر۔ اور پھر اسی عالم میں وہ اپنے گاؤں میں پہنچ گئے اور ابا سے ملے۔ ان سے کہا، دیکھئے۔ آپ سمجھتے تھے کہ میں نکما ہوں، اور آپ ہی ہمت والے ہمت ہیں۔ دیکھئے، کتنا بڑا دھندا ہے اپنا۔ دیس بدیس سے مال آتا ہے۔ انگور۔ سردہ۔ ناشپاتی۔ سیب۔ اور—اور—ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ابا پر کتنا رعب پڑے گا اور گاؤں والے کیسے ان کے آگے پیچھے پھریں گے کہ خیالوں کے اس تانے بانے میں صبح ہو گئی۔ کسی نے آواز دی "او لڑکے۔"

میاں مٹھو نے سمجھا کہ شاید کسی اور کو کوئی بلاتا ہوگا۔ لیکن جب لالہ جی نے اسے اٹھایا تو وہ اٹھے باہر دیکھا تو تارے چمک رہے تھے۔

"ہوں" میاں مٹھو نے کہا۔ "کیا ہے؟"

"کیا نہیں"؟ لالہ جی نے جھپک کر کہا: "سبزی منڈی چلنا ہے۔ وہاں بولی پر مال لینا ہے۔ بوریاں دوکان پر لانی ہیں۔ دوکان صاف کرنا، سجانا ہے اور دن کے کام کے لئے تیار ہونا ہے۔"

میاں مٹھو کے مونہہ سے نکلا "آپ کی دوکان کا بھلا نام کیا ہے؟"

جب لالہ جی نے کہا "لالہ ہمت رام اینڈ کمپنی، فروٹ

معاف کرو اس وقت کچھ نہیں ہے۔

نتیجہ!

مرچنٹ" تو وہ جھٹ سے کہہ اٹھے " ہمت تیرے ہمت کی ایسی تیسی"۔ اس سے پہلے کہ لالہ جی اس زبانی حملے سے سنبھلیں، میاں مٹھو یہ جا وہ جا۔ اور لالہ جی آوازیں دیتے ہی رہے "ارے لڑکے۔ او لڑکے"۔ لیکن میاں مٹھو کب سننے والے تھے۔ وہ تو ایسی جگہ کی کھوج میں تھے جہاں ہمت سے کوسوں دور رہ سکیں۔

جب مٹھو میاں دو تین گھنٹے کی آوارہ گردی کر چکے تو تھک گئے۔ کہیں سے گھڑیال بجنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک عمارت کی طرف بہت سے آدمی جا رہے تھے۔ مٹھو میاں بھی ان کے ساتھ چل دئے۔

اتوار کا دن تھا۔ یہ لوگ گرجا گھر جا رہے تھے۔ مٹھو میاں بھی ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ ایک پادری صاحب وعظ کہہ رہے تھے۔ اور میاں مٹھو کی بدقسمتی ــــ وعظ کے بعد انھوں نے ایک ایسا ذکر چھیڑ دیا جو میاں مٹھو کو سخت ناگوار گذرتا تھا۔ پادری صاحب کہہ رہے تھے " ہم نے جو یتیم بچوں کے لئے ادارہ کھولا ہے، اس کو چلانے کے لئے بہت ہمت اور محنت کی ضرورت ہے۔ بہت کچھ آپ نے کیا ہے۔ اور بھی بہت ہمت کرنی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی ہمت، محنت اور مشقت کی عادت سے بچے بھی سبق سیکھیں۔ ہم بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ان بچوں کو اچھا شہری بنانے کے لئے شروع سے ہی پڑھائی اور کام سکھایا جائے"۔
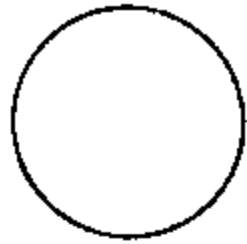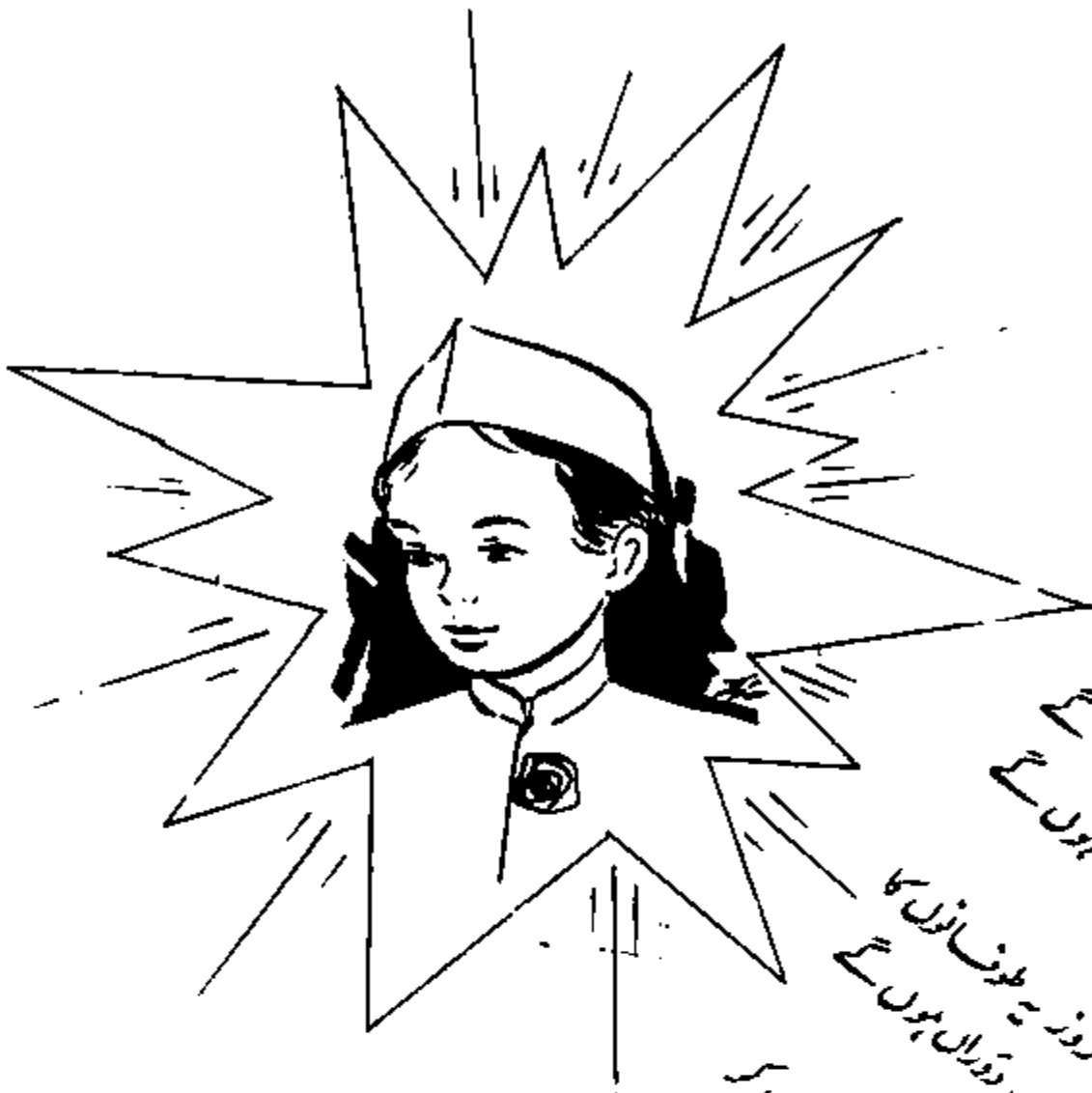
میاں مٹھو بیچ میں ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن وہ کسی کی پروا کئے بغیر تیر کی طرح دروازے سے نکل گئے۔ جب وہ گرجا کی باہر کی دیوار کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ لکھا تھا۔ منشی ہمت علی کی دی ہوئی تعلیم وہاں بھی کونے میں موجود تھی۔ وہ ہجے کر کر کے پڑھنے لگے۔ لکھا تھا: "کام عبادت ہے" اور اس کے بعد لکھا تھا: "پادری ہمت مسیح"۔

"ہمت۔ ہمت۔ ہمت" میاں مٹھو سوچنے لگے "اگر کام ہی کرنا ہے اور ہمت کو میرا پیچھا نہیں چھوڑنا ہے تو میرے ابّا میاں ہمت ہی کہاں کے بُرے ہیں۔ وہ بھی تو کام کو ہی کہتے تھے۔ تو چلا چل کر اُن کا ہی ہاتھ کیوں نہ بٹاؤں"۔

اور یہ سوچ کر وہ اپنے گاؤں کے راستے پر چل دئے۔ راستے میں لالہ جی کی دوکان پر پہنچے تو اُن سے کہنے لگے "لالہ جی آپ سچے اور میں جھوٹا"۔

"کیا؟" لالہ جی جو ایک ٹرک پر سے مال اُتار رہے تھے، اوپر سے ہی بولے۔ ٹرک ڈرائیور نے سمجھا۔ کوئی بات ہوگئی ہے شاید۔ وہ اُتر کر آیا تو میاں مٹھو نے اسے پہچان لیا، اور بڑے پیار سے بولا "سردار صاحب آپ بھی سچے میں جھوٹا"۔

ٹرک ڈرائیور ہنس دیا، اور کہنے لگا۔ "چلے گا؟" پھر وہ میاں مٹھو کو منشی ہمت علی کے قصبے میں اُتار کر آگے بڑھ گیا۔

اسکول میں میاں مٹھو نے ماسٹر صاحب کی دعا لی، اور گاؤں میں پہنچ کر ابا سے کہا " ابا آپ ٹھیک کہتے تھے"۔ اور ابا نے انھیں گلے لگا لیا۔

●●

نیا سال مبارک
کشور کیلاش پوری
جگمگاتا ہوا یہ سال مبارک ہو تمہیں
میرے بچو یہ نیا سال مبارک ہو تمہیں

کِس کی تصویر:

یہ کس کی تصویر ہے یہ معلوم کرنے کے لئے
ان حصّوں کو پنسل سے یا کسی رنگ سے بھر دو جن میں نقطے بنے ہوئے ہیں۔
اپنا جواب صفحہ ۱۶۰ سے مِلاؤ۔
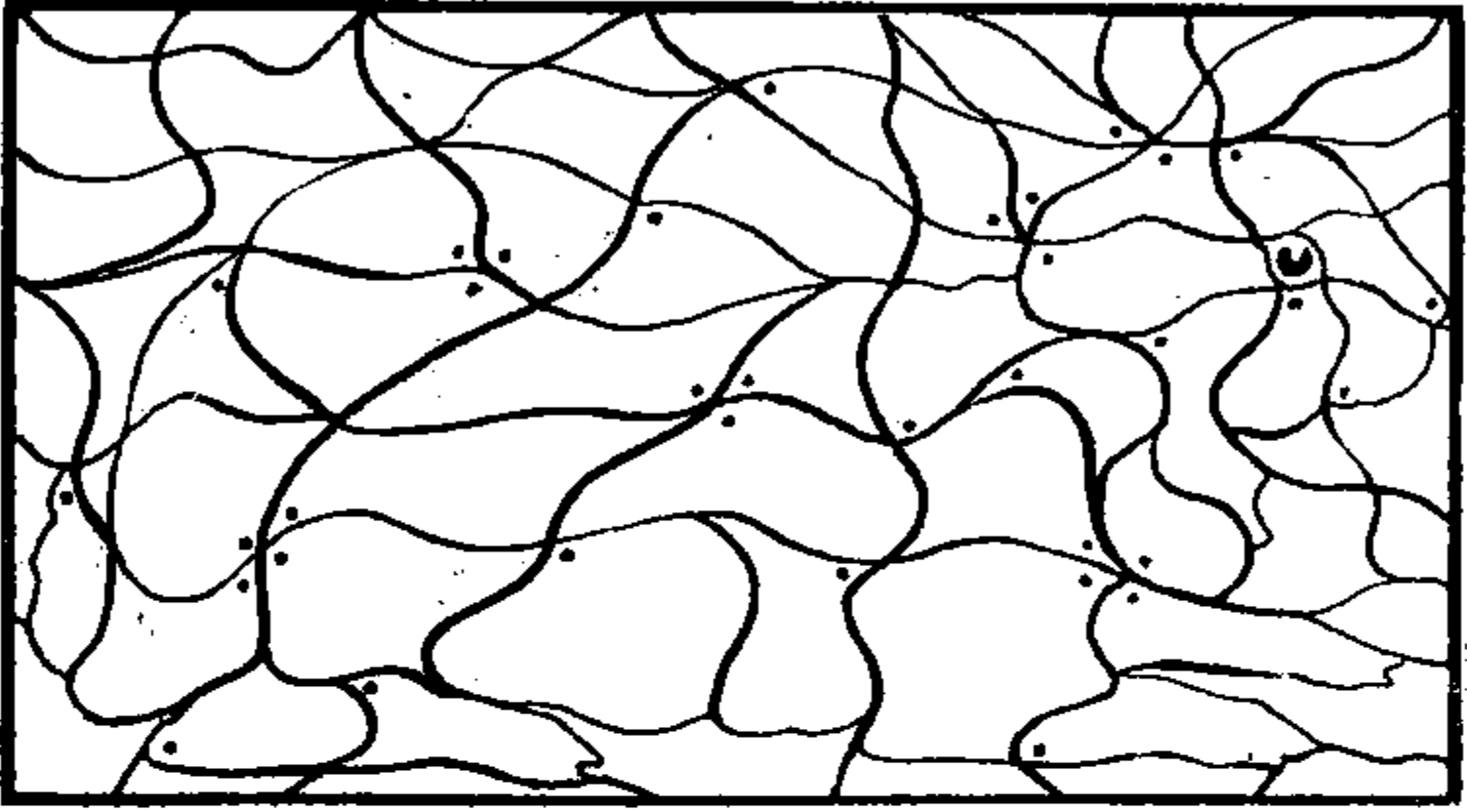
کھیلوں کے نام بتاؤ:

اِس تصویر کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ اس میں کون کون سے کھیل میں استعمال ہونے والی چیزیں دکھائی گئی ہیں؟

صحیح جواب صفحہ ۱۶۰ پر دیکھو۔

بخشش

م، ع، غم

"ابّا۔ ابّا ڈاکو کسے کہتے ہیں؟ جبّار خاں کے چھوٹے سے لڑکے نے جو دوسری جماعت میں پڑھتا تھا اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکو بڑے چور کو کہتے ہیں" جبّار خاں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"تو ابّا ڈاکو چور سے بھی بُرا ہوتا ہے؟"

"ہر وقت ٹائیں ٹائیں نہ کیا کرو" جبّار خاں نے جھنجھلا کر لڑکے کو ایک طرف دھکیل دیا اور خود اپنے گھوڑے کے پاس جا کر اُسے سفر کے لئے تیار کرنے لگا۔

جبّار خاں گھوڑے کو گھنے جنگل میں دوڑائے لئے جا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ اُس کا چہرہ سُرخ و سپید تھا اور اُوپری ہونٹ گھنی مونچھوں میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ جبّار خاں ڈاکوؤں کا سردار تھا۔ اس کے گروہ میں اُسے ملا کر سات ڈاکو تھے۔ یہ سب الگ الگ گاؤں اور قصبوں میں رہتے تھے۔ عام آدمیوں کی نظر میں یہ سیدھے سے کاروباری لوگ تھے۔ اس وقت جبّار خاں کو شہر سے دس میل کے فاصلے پر پھیلے ہوئے ایک جنگل کے غار میں پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے ملنا تھا۔ یہ غار ان کا اڈّہ تھا۔ یہیں ان کا اسلحہ وغیرہ چھپا رہتا تھا اور یہیں جمع ہو کر وہ منصوبے تیار کرتے تھے۔

آج رات انھیں شہر کے ایک بہت بڑے امیر سیٹھ نادر کے گھر ڈاکہ ڈالنا تھا۔

دن کا تیسرا پہر تھا غار ابھی پانچ میل دور تھا جبّار خاں کو اُمید تھی وہ سُورج ڈوبتے ڈوبتے اپنے ساتھیوں سے جا ملے گا۔ اچانک اُسے محسوس ہوا جیسے جنگل میں اس کے علاوہ

بھی کسی شخص کا گھوڑا دوڑ رہا ہو۔ اُس نے اپنا گھوڑا روک دیا۔ دوسرے گھوڑے کی ٹاپوں کی گونج صاف ہوتی گئی۔ چند لمحے بعد بائیں طرف سے ایک گھوڑا سوار جبار خاں کے سامنے آ گیا۔ جبار خاں کو دیکھ کر وہ رُک گیا۔ سانولے رنگ کا وہ جوان شخص صابر تھا۔ جبار خاں کے ساتھیوں میں سے ایک۔ سیٹھ نادر کے بارے میں ساری معلومات صابر نے اکٹھی کی تھیں جبار خاں نے آج کے لئے اُسے تاکید کی تھی کہ وہ سیٹھ نادر کی مشغولیتوں کا پتہ چلا کر آئے۔

"کیا خبر ہے صابر؟" جبار خاں نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

"بہت بُری خبر ہے اُستاد" صابر نے کہا۔" پرسوں شام کو سیٹھ نادر اور اُس کا جوان لڑکا اختر کسی جلسے میں گئے تھے۔ وہاں سے وہ گھر واپس نہیں پہنچے کل دن میں ایک اجنبی شخص سیٹھ کی بیوی کو بتا گیا تھا کہ وہ دونوں کسی ضروری کام سے باہر چلے گئے ہیں۔ سیٹھ کی بیوی مطمئن ہو گئی تھی لیکن کل رات اس کی کوٹھی پر ڈاکہ پڑ گیا۔ ڈاکو سارا دھن لوٹ لے گئے۔ سیٹھ اور اُس کا لڑکا ابھی تک لاپتہ ہیں"

"واقعی بُری خبر ہے۔" جبار خاں نے صابر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ صابر کچھ نہ بولا۔ جبار خاں نے اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگا کر آگے بڑھایا۔ صابر بھی اس کے برابر چلنے لگا۔ دونوں گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے سفر خاموشی سے کٹتا رہا۔ دو تین فرلانگ کے بعد انہیں راستے میں ایک شخص پڑا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور موہنہ پر پٹی کسی تھی۔ جبار خاں اور صابر گھوڑے روک کر نیچے اُترے۔ اُس شخص کے دونوں بازوؤں پر گہرے زخم تھے۔ وہ بے ہوش تھا۔ جبار خاں نے اس کے موہنہ پر بندھی ہوئی پٹی کھولی۔ یہ ایک جوان شخص تھا۔

"اُستاد اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہیں تو یہ سیٹھ نادر کا لڑکا اختر ہے" صابر نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ!" جبار خاں کی اُلجھن بڑھ گئی۔ اُس نے اپنے مفلر کو پھاڑ کر اختر کے زخموں پر باندھ دیا، پھر صابر سے بولا "ہم اسے اڈے پر لے چلیں گے۔"

صابر نے اختر کو اپنے گھوڑے پر ڈال لیا۔ جبار خاں اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ دونوں گھوڑے اپنی منزل کی طرف بھاگنے لگے۔ اندھیرا ہوتے ہوتے وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ باقی پانچ ڈاکو غار میں موجود تھے۔ اختر کو دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔ جبار خاں نے انھیں ساری بات بتا کر کہا "اب سیٹھ نادر کے یہاں ڈاکہ نہیں ڈالیں گے۔"

وہ سب آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ ان میں سے دو جوان تھے اور تین ادھیڑ عمر کے۔ ان سب کے موہنہ پر گھنی مونچھیں تھیں۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ غار میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ جبار خاں نے اختر کو فرش پر بچھے ہوئے گدّے پر لٹا دیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ غار میں مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ جبار خاں نے اختر کے بازو کھولے اور زخموں پر دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ پھر اُس نے اختر کے موہنہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تھوڑی ہی دیر میں اُسے ہوش آ گیا وہ کراہتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ ڈاکوؤں نے چہرے نقابوں میں چھپا لئے تھے۔

"آپ لوگ کون ہیں اور مجھے کہاں لے آئے ہیں؟" اختر نے ان سب پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے تمہیں جنگل میں زخمی حالت میں پایا تھا۔ اس لئے یہاں لے آئے" جبار خاں نے نرم آواز میں کہا "تم وہاں کس طرح پہنچے تھے؟"

"اگر میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تو یہ پرسوں رات کی بات ہے میں اپنے باپ کے ساتھ گھر واپس آ رہا تھا۔ ایک ویران سڑک پر کچھ ڈاکوؤں نے ہمیں روک لیا۔ انھوں نے اپنے پستولوں کے دستے ہمارے سروں پر مار کر ہمیں بے ہوش کر دیا۔ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے آپ کو غار میں پایا۔ وہاں دس بارہ ڈاکو تھے۔ وہ میرے باپ سے اُن کی خفیہ تجوریوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ بتا دیں، لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کی نظر میں دولت زندگی سے زیادہ قیمتی تھی۔ آخر ڈاکوؤں نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ ڈاکو میرے باپ کو دفن کرنے کے لئے اٹھا لے گئے۔ اُن کے سردار نے مجھ سے کہا کہ اگر میں انھیں سب کچھ بتا دوں تو وہ مجھے جان سے نہیں ماریں گے میں نے انھیں اپنے سارے گھر کا نقشہ سمجھا دیا۔ کل رات وہ مجھے اپنے ایک ساتھی کی نگرانی میں چھوڑ کر وہاں ڈاکہ ڈالنے چلے گئے۔ انھوں نے ساری دولت حاصل کر لی۔ آج میں نے اُن سے کہا کہ مجھے آزاد کر دیں تو انھوں نے چاقو سے میرے بازو کو زخمی کرنا شروع کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُن کے سردار نے کہا کہ وہ مجھے بے ہوش کر کے ایسی جگہ ڈال دیں گے جہاں سے میں اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ لیکن اُن کے اڈے کا پتہ نہ چلا سکوں۔ پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ ایک بار آنکھ کھلی تو خود کو جنگل میں بے بسی کی حالت میں پایا۔ میں کافی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ سانس لینے میں بھی پریشانی محسوس ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ اور اب ...." اختر نے کمزور آواز میں کہا "آپ لوگوں کے پاس بندوقیں اور پستول ہیں ۔ کیا آپ لوگ بھی ـــــ"

بس ـــ اب جلدی سے ایک تیز رفتار موٹر میرے حوالے کردو۔

"ہاں ہم لوگ بھی ڈاکو ہیں لیکن تمھیں ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جبار خاں نے ایک تھیلے میں سے کچھ پھل نکال کر اختر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"میں ڈاکوؤں سے نہیں ڈرتا۔ میں خود ایک بہت بڑے ڈاکو کا لڑکا ہوں" اختر نے بُرا سا موہنہ بنا کر ایک سیب اٹھا لیا۔

"کیا مطلب؟"

"ہماری ایک کپڑے کی مِل ہے جس سے ہماری گزر اوقات ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے باپ کو دولت کی ہوس تھی۔ اس کے لئے انھوں نے گوداموں میں غلہ بھر کر اُس کی قیمت بڑھائی، چوری چوری افیون اور شراب کی تجارت کی اور سونا اِدھر سے اُدھر کیا اور نہ جانے کتنے غلط کام کئے اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ایسی دولت تجوریوں میں بھرنے سے کوئی فائدہ نہیں جسے ہم دوسروں پر ظاہر نہ کر سکیں جو بے ایمانی سے حاصل کی جائے۔ یہ کالی دولت پا کر ہم خود کو بڑا آدمی سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ ہم کو کبھی خوشی نہیں دے سکتی۔ آخر اسی دولت کی ہوس نے میرے باپ کی جان لے لی" اختر نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا" مجھے اپنے باپ کی موت کا افسوس بھی ہے اور اس بات پر شرمندگی بھی کہ میں ایک ایسے شخص کا بیٹا ہوں جو اپنے وطن کا

"اب تم کیا کروگے ؟" جبار خاں نے آہستہ سے پوچھا۔

"میں نے ڈاکوؤں کو اپنے گھر کے تہہ خانے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اگر تم لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا تو میں وہاں چھپی ہوئی دولت غریبوں میں بانٹ دوں گا۔ میں ایسی خوشی نہیں چاہتا جو دوسروں کو برباد کر کے حاصل کی جائے۔"

ایک ڈاکو نے غار سے باہر جاتے ہوئے جبار خاں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ جبار خاں باہر پہنچا تو اُس نے کہا "اُستاد کیوں نہ اختر کو ہم یہاں کچھ روز قید رکھیں اور اس کی چھپی ہوئی دولت اُڑا لائیں۔"

"نہیں سجاد! میری سمجھ میں ایک دوسری بات آ رہی ہے" جبار خاں نے جواب دیا اور غار میں واپس آ کر اختر سے بولا "اگر تم چاہو تو میں ابھی تمھیں شہر کی سرحد پر چھوڑ آؤں۔"

اختر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جبار خاں اپنے ساتھیوں سے غار میں رُکنے کو کہہ کر اختر کے ساتھ چلا گیا۔ آدھی رات کے قریب وہ اکیلا لوٹا تو اس کے ساتھی بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے غار میں آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے اُستاد؟ تم پریشان دکھائی دے رہے ہو ہو" ایک اُدھیڑ عمر کے ڈاکو نے کہا۔

"ا خیار خاں میں واقعی پریشان ہوں" جبار خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ بیٹا بھی اپنے باپ کی بُرائیوں سے نفرت کر سکتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر ہمارے بچوں کو کبھی یہ معلوم ہو گیا کہ اُن کے باپ ڈاکو تھے تو کیا وُہ بھی ہم سے نفرت کرنے لگیں گے۔ آج مجھے یہ خیال بھی آ رہا ہے کہ شاید ہم میں سے کچھ کی بیویاں بھی ہمارے کام کو پسند نہ کرتی ہوں۔"

"اُستاد آپ کا خیال صحیح ہے۔ میری بیوی نے کئی بار مجھے اس زندگی سے منع کیا ہے" ایک اُدھیڑ عمر کا ڈاکو بولا اور اُستاد جب میری لڑکی مجھ سے پوچھتی ہے کہ میں کئی دن گھر کیوں نہیں آتا تو میں اُس سے جھوٹ بولتے ہوئے شرم سے زمین میں گڑ جاتا ہوں۔" ایک دوسرا ڈاکو بولا۔

"تو پھر ہم جھوٹی خوشی کے اس راستے پر نہیں دوڑیں گے جس کا خاتمہ اس جگہ ہوتا ہے، جہاں سے ہمارے بچوں کے دُکھوں اور نفرت کا راستہ شروع ہوتا ہے۔ اب ہم ایسی دولت اکٹھا نہیں کریں گے جسے ہمارے اپنے بچے بھی ٹھکرا دیں آج کے بعد ہم اس غار میں نہیں جمع ہوں گے اب ہم کوئی سیاہ منصوبہ نہیں بنائیں گے۔ آج سے ہم صرف اپنے اس کاروبار میں دلچسپی لیں گے جس میں کوئی بے ایمانی نہیں ہے۔" جبار خاں نے جوشیلی آواز میں کہا تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟"

"ہم تیار ہیں۔"

"ہم سب تیار ہیں۔"

"ڈاکو کیسا ہوتا ہے؟" جبار خاں نے اپنے لڑکے کو گود میں اُٹھا کر پوچھا۔

"ڈاکو بہت بُرا ہوتا ہے۔"

"ہمارا بیٹا بڑا ہو کر ڈاکو تو نہیں بنے گا" جبار خاں نے پوچھا۔

"میں ڈاکو نہیں بنوں گا۔ میں اپنے ابا کی طرح اچھا آدمی بنوں گا۔" لڑکا بولا۔

جبار خاں نے خوشی سے بے قابو ہو کر لڑکے کو ہوا میں اُچھالا اور اُسے دوبارہ اپنے بازوؤں میں پکڑ کر چوم لیا۔ آج اُسے سچی خوشی مل گئی تھی۔ ●●

نتیجہ نیا مقابلہ نمبر ۱۱

جنوری کے کھلونا میں ایک مقابلہ شائع ہوا تھا جس کا صحیح جواب ہمیں ۱۴۲۲ بہن بھائیوں نے دیا ہے۔ ان میں سے دس بہن بھائیوں کو ایک ایک روپے کی کتابیں انعام دی جا رہی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بہن بھائیوں کے نام شائع کئے جا رہے ہیں۔

انعام پانے والے بہن بھائی :

۱۔ ایوب عبدالکریم، پوسٹ سونس ضلع رتناگری ۲۔ رضوان الدین احمد، بھوپال ۳۔ رخسانہ کمل۔ نمبر ۱ المشی صدرالدین کلکتہ ۴۔ مشاہدہ احمد، مونگیر ۵۔ ممتاز بیگم، مونگیر ۶۔ محمد جاوید اسماعیل، حیدرآباد ۷۔ امام توقیر، کلکتہ ۸۔ زبیر احمد صدیقی، کان پور۔ ۹۔ شمینہ خان، امراوتی ۱۰۔ جوہرا اسرائیل، مرادآباد۔

دوسرے بہن بھائیوں کے نام :

انصار الحق، ایوت محل۔ مدحت فاطمہ، علی گڑھ۔ افسر کمال، مظفرپور شیب انور، کان پور۔ شمس الزماں، کان پور۔ اعجاز الدین، میرٹھ۔ صابرہ، حجا حجا۔ نشاط انور، کان پور۔ حسن جمیل، گورکھپور۔ جمیلہ خاتون، کیپٹن گنج۔ محمد شریف، بمبئی۔ ضیاء الرحمن، ناسک آفتاب، مرادآباد۔ وجاہت کریم، آگرہ۔ عمران، ملیح آباد۔ عبدالحمید کریم نگر۔ شکیلہ، پٹنہ۔ طالب، بھوپال۔ فیروز، کان پور۔ فرح الدین نشاط، کان پور۔ شفیق، سری نگر۔ لال محمد، سرائے سوا سلیم انور، نگینہ۔ خالد، کان پور۔ وجاہت برہان پور۔ اسفندیار۔ اورنگ آباد۔ رشید احمد، مالیگاؤں۔ طارق، علی گڑھ۔ شبیر نقوی

۱۔ یہ کتابیں کس مصنف نے لکھی ہیں ؟

۲۔ اس لڑائی میں کون جیتے گا ؟

صحیح جواب : ۱۔ کرشن چندر ۲۔ نیولا

جوابات

صفحہ نمبر ۱۴۰ :
نمبر۴ اور نمبر۱

صفحہ نمبر ۱۴۲ :
نمبر۱ اور نمبر۴ ایک جیسے ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۴۸ :
لا ۴ ، ب ۳ ، ج ۵ ، د ۱ ، ۲۵

صفحہ نمبر ۱۵۴ :
کرکٹ ، ٹینس ، فٹ بال ، ٹیبل ٹینس ، اور بلیرڈ
عکس کی تصویر" کا صحیح جواب : خرگوش

مونگھیر۔ ماہ طلعت ۔ برہان پور ۔ اظہر عزیز، علی گڑھ ۔ شکیل، ریواں ۔ رفیق النسار، ایوت محل ۔ طارق عبد اللہ، سری نگر۔ ثمیمہ ۔ مظفر پور۔ سلیم الدین، بھوپال ۔ سہیل احمد، مونگھیر شہاب الدین، دربھنگہ ۔ نیلوفر، علی گڑھ ۔ شعیب، لکھنو۔ شہناز، جون پور ۔ جمال، علی گڑھ ۔ سید حسین : آسنسول ۔ عبد الحمید، لبتی ۔ چندرک پرشاد، سرسوا ۔ نجمہ، دہلی ۔ محمد سلیمان، دہلی ۔ فیروز بخت، دہلی ۔ عمران، کان پور ۔ ایس، اے، پٹیل ۔ بھیمڑی ۔ محمد سلیم، بمبئی ۔ محمد طاہر، کان پور ۔ ماجد علی، رام پور ۔ طیر النساء بیگم کلکتہ ۔ وسیمہ، ڈالٹین گنج ۔ صلاح الدین، گیا ۔ یوسف، گیا۔ طلعت فاطمہ، کلکتہ ۔
جمشید، آگرہ زبیر اشرف، پالن پور ۔ خسرو دانش، کلکتہ، ذو القدر، حیدرآباد عبد الغنی، بھونیشور، زبیدہ خاتون، حیدرآباد، قیصر، کٹک، مظفر علی، کلکتہ غلام سرور، گاذیپور، اشرف، بہار شریف، مسعود اقبال، گلبرگہ، ایم مسعود احسن، فضل، حاجی پور، نادرہ، مونگیر، شفیق، حیدرآباد، حمید، اندور رعنا شاہین، بھوپال، پرویز احمد، کلکتہ، عزیز الرحمٰن، دہلی، عبد السلام، کلکتہ، مشتاق، کلٹی، روبینہ، جھارکھنڈ، اقبال، رام پور، محمد ریاض، شیخوپورہ سعید الدین، کان پور، راشد، مرادآباد، انجم بیگم، لکھنؤ، وسیم الحق، مونگیر حامد علی، کریم نگر، سنجیدہ، مونگیر، نجمہ، علی گڑھ، محمد شاہد، اسٹا، بلال بھیونڈی، شہناز، آسبور، قائد حسین، کان پور، فخر الحسن، ملیح آباد کمال احمد، ملیح آباد، عبد الکریم، اندور، زبیر، بمبئی، خلیل الحق، اکولہ، خورشید، گیا احمد عبد اللہ، مظفر پور۔ آفتاب احمد، بجا جا۔ خالد، بریلی ۔ ممتاز جہاں، امین معین الدین، کوٹہ ۔ ماہ طلعت، سنبھل پور۔ مسعود اختر، کانپور۔ ساجد، کانپور فیض اللہ، دھنباد۔ نصرت اللہ، وارانسی، منی بیگم، دھنباد، عبد النعیم، حیدرآباد نسیم اختر، سیتامڑھی۔ مظاہرہ خاتون، بریلی۔ صبا آرا، کلکتہ: منظر اعظم گڑھ۔ نجم الحسن، اورنگ آباد ۔ انوار، حیدرآباد ۔ اقبال احمد، میرٹھ ۔ صالحہ، فتح پور غوثیہ پروین، ناسک ۔ نکہت، دہلی۔ خدیجہ، اندور۔ ارشد، وارانسی، جاوید مالیگاؤں۔ فہیم اکبر، پٹنہ ۔ عزیز احمد، پورنیہ۔ شاہینہ، پٹنہ۔ مہر فاطمہ، حیدرآباد ماہ رخ ۔ جے پور۔ توصیف، لکھنؤ۔ عاصم، کانپور۔ طارق حمید، سری نگر۔ عمر، اورنگ آباد۔ طاہر علی، حیدرآباد۔ عارفین، بلاسپور۔ فریدہ، مدھوبنی۔ اعجاز احمد، بنگلور۔ افسر علی، علی گنج ۔ اطہر حسین، سیلون۔ رحمان، جمشید پور زاہد حسن، جعانسی، ریاض احمد، الوپ پور۔ امین قریشی، احمد آباد۔ نعیم، بنگلور فردوس فاطمہ، بنگلور۔ ظفر الہدیٰ، کشن گنج۔

تصویری کارٹون

نمبر ۳۰

جنوری کے کھلونا میں ایک تصویری کارٹون
شائع ہوا تھا جس میں
ایک بچّہ کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کا سب سے اچّھا
اور دل چسپ جواب
ایم ایس مصطفیٰ کمال (رانچی) نے لکھا ہے۔
"میں عید کا چاند نہیں بلکہ اپنے ڈیڈی کو دیکھ رہا
ہوں جو چاند پر گئے ہیں"۔
انہیں دس دل چسپ کتابیں انعام دی جا رہی ہیں۔

نتیجہ انعامی تصویر نمبر ۲۸

جنوری ۱۹۶۹ کے کھلونا میں ایک تصویر شائع ہوئی تھی، جس کا سب سے اچّھا اور دل چسپ عنوان سلطانہ (میر گنج، سارن) نے لکھا ہے "تیسری منزل"۔ انہیں دو روپے کی کتابیں انعام دی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ عنوانات بھی پسند آئے۔ خوشی کا لمحہ (عبد الصمد، کلکتہ) تم جیو ہزاروں سال (رخسانہ گُل، کلکتہ۔ انجم بانو، پٹنہ۔ شمیم صدّیقی، علی گڑھ۔ رئیس اختر قمر، بھوپال) سب کا پیارا راج دُلارا (فضل الرحمان خرم، حیدرآباد)

تصویری کارٹون نمبر ۳۱

تصویر: اے ایل سید

اوپر ایک تصویر شائع کی جارہی ہے، مگر یہ کیا——؟ یہ بچی اپنی سہیلی سے کیا کہہ رہی ہے؟
ہاں بھئی یہ تصویری کارٹون ہے، اس میں بات چیت تمہیں بھرنی ہوگی اور اس پر انعام ملے گا۔ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر "تصویری کارٹون نمبر ۳۱، ماہنامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱" کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۴۔ فروری ۱۹۶۹ تک ملنے والے جوابوں میں جو جواب سب سے دلچسپ اور مزاحیہ ہوگا اس کے بھیجنے والے کو دس دلچسپ کتابیں انعام دی جائیں گی۔

تصویری کارٹون، ماہنامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی

KHILAUNA New Delhi | 21st year of publication | ANNUAL For 1969
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 637/57 | Regd. No. D-71